مولانا مودودی کے تصوّرات

(ایک تجزیہ)

فیروز الدین منصور

پیپلز پبلشنگ ہاؤس © لاہور

مولانا مودودی

تصوّراتؒ

مولانا مودودی کے تصورات

ایک تجزیہ

فیروز الدین منصور (مرحوم)

غلامی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کو جائز قرار دینے والے
مولانا ابوالاعلےٰ مودودی کے معاشی، سیاسی اور اخلاقی تصورات
کا تاریخی حقائق اور انسانی فکر و عمل کی روشنی میں تجزیہ

پیپلز پبلشنگ ہاؤس
پوسٹ بکس نمبر ۸۶۲ ۔ لاہور

بار ششم ——————— ۱۹۷۹ء

ناشر ——————— عبدالرؤف ملک

پیپلز پبلشنگ ہاؤس۔ لاہور

مطبع ——————— اسلامیہ السعودی پرنٹرز مزنگ
چوہتی لاہور

قیمت :- ——————— روپے

فہرست مندرجات

معروضات

زیرِ نظر کتاب "مولانا مودودی کے تصورات - ایک تجزیہ" پہلے پہل فروری ۱۹۵۱ء میں مودودیات کے نام سے شائع ہوئی تھی اس وقت اس کی ضخامت محض ۷۲ صفحات تھی - اس چھوٹی سی کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اپریل ۱۹۵۱ء کے آخر تک یعنی صرف دو ماہ کے قلیل عرصہ میں اس کتاب کی تمام کاپیاں فروخت ہوگئیں اور دوسرے اڈیشن کی ضرورت محسوس ہوئی - لیکن مئی ۱۹۵۱ء میں جب اس کتاب کے دوسرے اڈیشن کی اشاعت کے لئے ترمیم و اضافہ کیا جارہا تھا تو سابق صوبہ پنجاب کی حکومت نے مصنف کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کرکے جیل میں نظر بند کردیا اور دوسرا اڈیشن شائع نہ ہوسکا۔

دسمبر ۱۹۵۱ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد مصنف نے اس کتاب کو از سر نو لکھا اور اس میں گرانقدر اضافہ کیا - اس اضافہ سے کتاب کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی - یہ دوسرا اڈیشن مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا - اس کی ضخامت پہلے اڈیشن سے دوگنا یعنی ۱۴۴ صفحات تھی - یہ اڈیشن بھی پہلے کی طرح بہت مقبول ہوا اور باوجود کثیر تعداد میں شائع ہونے کے ڈیڑھ سال کی مختصر مدت میں ختم ہوگیا - اس کے بعد مصنف اس میں مزید ترمیم و اضافہ کرنے اور کتاب کی افادیت کو بڑھانے کے لئے مزید مواد اکٹھا کرنے کے لئے کوشاں تھے کہ جولائی ۱۹۵۴ء میں حکومت نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کو خلافِ قانون قرار دے دیا - چونکہ مصنف پارٹی کے ایک اعلیٰ رکن تھے لہٰذا ان کو اور پارٹی کے متعدد دیگر کارکنوں کو مختلف جیلوں میں نظر بند کردیا گیا - یہاں تک کہ کتاب کے ناشر کو بھی نظر بند کرکے اس کے اشاعتی ادارے کو سر بمہر کردیا گیا اور کتابوں کا بہت سا ذخیرہ تلف ہوگیا۔

قید و بند کا یہ سلسلہ کم و بیش ایک سال جاری رہا - رہائی کے بعد مصنف کی صحت اس قابل نہ تھی کہ وہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دے سکتے - اس وقت کی حکومت کے معاندانہ رویہ کی وجہ سے حالات اس قدر نامساعد تھے کہ نہ تو فیروزالدین منصور (مرحوم) کو ذہنی اور جسمانی سکون نصیب ہوا کہ وہ کتاب پر نظرِ ثانی کرسکتے اور نہ ہی ناشر حکومت کی عائد کردہ پابندیوں کی وجہ سے اس قابل تھا کہ وہ کتابوں کی نشر و اشاعت کا کام کرسکتا۔ انہی نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ساڑھے تین سال بیت گئے کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کا نفاذ ہوا اور حکومت نے پھر منصور مرحوم اور دوسرے متعدد کمیونسٹ رہنماؤں کو گرفتار کرکے ملک کی مختلف جیلوں میں بند

کردیا۔ منصور مرحوم کی صحت پہلے ہی بہت خراب تھی اس پر بہاولپور جیسے گرم مقام کی جیل میں سی کلاس کی نظربندی نے ان کی رہی سہی صحت کو بالکل ختم کردیا۔ چنانچہ جب وہ رہا ہوئے تو ان کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی اور وہ چند ہفتوں کے بعد اپنے آبائی شہر شیخوپورہ میں ۲۳ جون ۱۹۵۹ء کو وفات پا گئے اور وہیں ہی دفن کئے گئے۔

فیروزالدین منصور مرحوم نے جس جوانمردی اور استقامت کے ساتھ تمام عمر غیر ملکی سامراج کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لیا اس کی مثالیں ہماری تحریک آزادی کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ ان چند سطور میں مرحوم کے شاندار کارناموں کا بالتفصیل ذکر کرنا اور شایانِ شان ہدیہ عقیدت پیش کرنا ممکن نہیں۔ یہ کام تو مرحوم کے اُن دیرینہ رفقا کا ہے جو عرصہ دراز تک مرحوم کے ساتھ مختلف سیاسی تحاریک میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ منصور مرحوم اور دیگران تمام لوگوں کے حالات وکوائف مرتب کرکے قلمبند کئے جائیں جنہوں نے اپنی زندگیاں ملک وقوم کے لئے وقف کردیں اور ساری عمر غیر ملکی سامراج کے خلاف لڑتے رہے۔ یہ کام اس لئے بھی ضروری ہے کہ آنے والے دور کا مورخ ملکی آزادی کے لئے ان قابلِ احترام شخصیتوں کے شاندار کارناموں کو فراموش نہ کردے۔

منصور مرحوم کی وفات کے بعد ان کی اس تصنیف کا نیا اڈیشن شائع کرنے کی اشد ضرورت محسوس کی گئی لیکن ناسازگار حالات کی وجہ سے کتاب کی اشاعت معرض التوا میں پڑی رہی گزشتہ کچھ عرصہ سے راقم اسی کوشش میں تھا کہ ان کی اس کتاب کو بنیاد بنا کر کوئی دوست اس میں ضروری ترمیم واضافہ کریں کیونکہ گزشتہ دس بارہ برس میں (اس کتاب کی گزشتہ اشاعت کے بعد سے اب تک) قومی اور بین الاقوامی حالات سے مجبور ہو کر مولانا مودودی نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جو نئے تصورات اور رجحانات پیش کئے ہیں اُن میں ان کے گزشتہ موقف (جس کا اس کتاب میں تجزیہ کیا گیا ہے) سے قدرے انحراف ظاہر ہوتا ہے۔ اس انحراف کے جواز اور سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے انہوں نے جو تاویلیں پیش کی ہیں وہ خاصی دلچسپ ہیں اور ایک مؤرخ کو تجزیہ کے لئے کافی مواد فراہم کرتی ہیں۔

اس کتاب کا یہ نیا اڈیشن (بلاترمیم) اس امید کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے کہ منصور مرحوم کے دیرینہ رفقا میں سے کوئی صاحب یا کوئی اور اہلِ علم جسے ان مسائل سے شغف ہو، اس کتاب کی بنیاد پر مولانا مودودی کے نئے رجحانات کا تجزیہ کریں گے اور لوگوں کو مولانا کی نظریاتی رجعت پسندی اور فکر وعمل کے تضاد سے آگاہ کریں گے۔ قارئین اور اہلِ علم اصحاب اپنی آرا سے ناشر کو مطلع فرمائیں۔

عبدالرؤف ملک

دیباچہ

انسانی تاریخ شاہد ہے کہ وسائلِ ثروت کے مالک حکمرانوں نے اپنے مخالف عوامی تحریکوں کو دبانے کے لئے مذہب کو ہمیشہ ایک ہتھیار کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ عیسائیت کے خلاف اس کے ابتدائی دَور میں جب وہ غلاموں، غریب کاشت کاروں، دست کاروں اور مفلوک الحال بے روزگاروں کی تحریک تھی، دولتمند یہودیوں اور غلام دار رُومی حکمرانوں نے اسے دبانے کے لئے اپنے اپنے قدیم مذاہب کو ہتھیار بنا کر استعمال کیا۔ کم و بیش انہی حالات کا مقابلہ رسُولِ اکرمؐ کو مکہ میں کرنا پڑا۔ قریش اُمرا نے قدیم قبائلی مذہب کے ہتھیار سے اسلام کا مقابلہ کرنے کی انتہائی کوشش کی اور جب یورپ میں مطلق العنان جاگیرداری بادشاہت کے خلاف جدید سرمایہ داری نے جدوجہد شروع کی تو اسے دبانے کے لئے مطلق العنان بادشاہوں نے کیتھولک کلیسا کو استعمال کیا۔

آج سرمایہ داری نظام آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ سوویٹ یونین، عوامی چین اور مشرقی یورپ کی عوامی جمہوریتوں کے ۸۰ کروڑ انسان سرمایہ داری نظام کے چنگل سے آزاد ہو چکے ہیں اور باقی ساری دُنیا کے مزدور، کسان، مزارعہ، کھیت مزدور اور نچلے اور درمیانہ طبقوں کے عوام آزادی حاصل کرنے کے لئے اٹھ رہے ہیں جدوجہد کر رہے ہیں۔ چنانچہ انہیں دبانے کے لئے حکمران طبقے جو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں

پر مشتمل ہیں کئی قسم کے ہتھیار لے کر میدان میں آگئے ہیں۔ ان ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار مذہب بھی ہے۔ پہلے سرمایہ داروں کی سیاسی پارٹیاں مذہب یا فرقہ کی بنا پر منظم نہیں تھیں۔ اب مغربی جرمنی میں کرسچین ڈیموکریٹک یونین، اٹلی میں کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی، ہالینڈ اور بلجیم میں کیتھولک ڈیموکریٹک پارٹیاں اور فرانس میں کیتھولک ری پبلکن پاپولر موومنٹ (ایم۔آر۔پی) رجعت پسند جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی سب سے زیادہ مضبوط سیاسی پارٹیاں ہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں، اطالوی پارلیمنٹ کے انتخاب میں پاپائے روم نے تمام پادریوں، راہبوں اور کلیسا کے مدارس کے اساتذہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ کمیونسٹوں، سوشلسٹوں وغیرہ کے متحدہ محاذ، پاپولر فرنٹ کو ناکام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں اور میلان کے آرچ بشپ کارڈینل شسٹر نے اعلان کیا تھا کہ "پاپولر فرنٹ کو ووٹ دینے والوں کو خدا کی بادشاہت میں کوئی جگہ نہیں ملے گی" اور "آسمانی باپ ان سے اپنی تمام رحمتیں چھین لے گا"۔

انگریز، امریکی، فرانسیسی اور ڈچ سامراجیوں کے قائم کردہ نیم سرمایہ داری اور نیم جاگیرداری نوآبادیاتی نظام کے خلاف عوامی جدوجہد سارے ایشیا میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ایران، مصر اور مراکش کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ عوامی جدوجہد کے سیلاب نے مسلمانوں کے خطوں میں بھی سامراجی نظام کے مضبوط قلعوں کو پاش پاش کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ تقریباً تمام مسلم ممالک کے رجعت پسند جاگیردار اور سرمایہ دار اسلام کے نام پر عوامی تحریکوں کے خلاف صف باندھ کر کھڑے ہو رہے ہیں۔

کُل دنیا کے سامراجی حکمران اسلام کے نام پر عوامی تحریکوں کے خلاف

صف آرائی کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت کیتھولک کلیسا کی تبلیغی انجمن کا ایک بیان ہے جو روم میں ۲۵ - نومبر ۱۹۴۹ء کو دیا گیا تھا اور جو ۲۶ - نومبر کے سول ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا۔ اس بیان میں تبلیغی انجمن نے فوجی اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے اسلامی ممالک کی مرکزی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کیتھولک عیسائیوں کو بالخصوص یہ مژدہ سنایا تھا کہ "اس وقت مسلمانوں میں نہایت ہی صحت مند قسم کی مذہبی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور یورپ کے باشندوں سے کہیں زیادہ مسلمان علماء کمیونزم سے اپنے مذہب کو خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔" چنانچہ "خدا کی حمایت میں کمیونزم کے خلاف عیسائیوں اور مسلمانوں کے متحدہ محاذ" پر زور دیتے ہوئے تبلیغی انجمن نے کیتھولک عیسائیوں کو ہدایت کی کہ وہ "پہل قدمی کریں اور متحدہ محاذ قائم کرنے کے لئے مؤثر قدم اٹھائیں۔"

ہمارے اپنے وطن پاکستان میں رجعت پسند جاگیرداروں اور بڑے سرمایہ داروں نے اسلام کے نام پر عوامی تحریکوں کی مخالفت کو ایک فیشن یا پیشہ بنا رکھا ہے۔ تحریک خواہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی ہو، خواہ اجرتیں بڑھانے، مہنگائی بھتہ حاصل کرنے یا چھانٹی کی روک تھام کرنے کے لئے مزدوروں، چپڑاسیوں یا کلرکوں کی ہو، خواہ مہاجرین کی بحالی سے تعلق رکھتی ہو، خواہ زرعی اصلاح کے لئے مزارعوں اور غریب کسانوں کی ہو، اور خواہ تحریک کا مقصد قومی صنعت کی حفاظت ہو، پاکستان میں اسلام کو اس کے خلاف ایک حربے کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

یوں تو مسلم لیگی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے تعلق رکھنے والے علماء بھی اسلام کے نام پر عوامی تحریکوں کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مگر جماعت اسلامی سب سے

پیش پیش ہے - اس کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جاگیرداری اور سرمایہ داری کی حمایت میں فاشسٹوں کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی فکر و عمل اور کمیونسٹوں کے خلاف سامراجی حکمرانوں کے پروپیگنڈا کو ایک نظام کی شکل دے کر اسے "اسلام کے نظامِ حیات" کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔

ایک سال کا عرصہ ہوا مولانا مودودی کے پیش کردہ "اسلام کے نظامِ حیات" کی حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے میں نے ایک کتابچہ نہایت عجلت میں "مودودیات" کے نام سے لکھا تھا جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اور دوبارہ اشاعت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ملک کے چاروں طرف سے پبلشرز کے پاس مزید مانگ کے خطوط آتے رہے ہیں اور ان کے اصرار سے میں نے اس مختصر پمفلٹ پر نظرِ ثانی ضروری سمجھی اور ضروری اضافہ محض اس لئے کیا کہ ناظرین کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

پچھلے پمفلٹ میں جو ۲۴ صفحات اور دو ابواب پر مشتمل تھا اب "مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اخلاقی تصورات" کے عنوان سے ایک اور باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

فیروزالدین منصور

مورخہ ۲۰- جنوری ۱۹۵۲ء

معاشی تصوّرات

فکر و عمل میں تضاد

پاکستان کے محنت کش مظلوم عوام غیر ملکی سامراجیوں اور پاکستان کے بڑے بڑے تاجروں اور جاگیرداروں کے حیاسوز براہ راست اور وحشیانہ استحصال کے خلاف کھڑے ہو کر روٹی، روزگار، زمین اور جمہوری آزادی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں اور اس جد و جہد کو بے اثر اور ناکام بنانے کے لئے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے تنخواہ دار مولوی بڑے زور شور سے یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ "اسلام بذاتِ خود ایک الگ اور مکمل نظام حیات ہے۔" اور "اسلام کے نظامِ حیات اور کمیونزم میں کوئی چیز مشترک نہیں۔" وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ "کمیونزم اور اسلام ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔" اور "کمیونزم کو مٹائے بغیر نہ اسلام قائم رہ سکتا ہے اور نہ مسلمان زندہ رہ سکتے ہیں۔" پنجاب کے سرکاری مولوی

ابو الحسنات، جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مرزائیوں کے خلیفہ ثانی بشیر الدین محمود تینوں کو اس بات پر اتفاق ہے

مگر ان "علمائے دین" میں سے کسی نے بھی آج تک یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ موجودہ دور میں اس نظام کی اقتصادی، سیاسی اور سماجی شکل کیا ہوگی جسے وہ اسلامی نظام کہتے ہیں۔

رجعت پسند سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی موجودہ برسر اقتدار جماعت مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے "علمائے دین" ایک ہی سانس میں مختلف و متضاد باتیں کہتے ہیں۔ ایک طرف یہ مولوی کمیونزم پر اسلامی مساوات، جمہوریت اور اخوت" کی بلندی اور برتری ثابت کرنے کے لئے اس جمہوریت، مساوات اور اخوت کا تذکرہ کرتے ہیں جو رسالت اور خلافتِ راشدہ کے عہد میں مدینہ میں تھی اور دوسری طرف بنو امیہ، بنو عباس اور دوسرے مسلمان شاہی خاندانوں کے مطلق العنان اور جابر بادشاہوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے نہیں تھکتے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ان بادشاہوں کی فہرست میں چنگیز اور ہلاکو کو بھی شامل کر لیتے ہیں، اور کمیونسٹوں کی اس بنا پر مذمت کرتے ہیں کہ وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کو ختم کر کے امیر و غریب کی تمیز مٹانے اور سب میں برابری قائم کرنے کی جد و جہد کر رہے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ اس قسم کی مساوات اسلام کے منافی" اور "قدرت کے تقاضوں کے خلاف جنگ" کے مترادف ہے۔ ایک طرف وہ خلفاء راشدین کے عہد میں اس دور کا تذکرہ کرتے ہیں جب کہ عراق ایران اور شام میں مسلمانوں کی فتوحات کے سبب مالِ غنیمت کی آمد اور مدینہ میں اس کی تقسیم سے کوئی زکواۃ لینے والا نہ رہا تھا، اور دوسری طرف "کمیونزم کی اسلام

دشمنی" ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ "زکوٰۃ اور خیرات مسلمانوں پر فرض ہے اور اگر سب برابر ہو گئے۔ کوئی امیر و غریب نہ رہا، تو زکوٰۃ اور خیرات لینے والے نہیں ہوں گے اور اسلام کی رُو سے جو فرض مسلمانوں پر عائد ہے، اسے مسلمان ادا نہیں کر سکیں گے۔" مرزائیوں کے اخبار الفضل نے انہی دلائل کو پیش کرتے ہوئے کمیونسٹوں کی جد و جہد کو کئی بار "مداخلت فی الدین" قرار دیا ہے۔

یہ علماء اپنے پیش رو انگریز پرست علماء کی طرح جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے کے ہر جائز و ناجائز فعل کو اسلام کی رُو سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبد الحامد بدایونی، مولوی ابوالحسنات وغیرہ کے جاگیرداری نظام اور پبلک سیفٹی ایکٹ کی حمایت میں فتوے اس بات کے بین ثبوت ہیں۔

پاکستان کے موجودہ برسر اقتدار گروہ مسلم لیگ سے تعلق نہ رکھنے والے علماء میں سب سے زیادہ منظم جماعت اسلامی کے مولوی ہیں۔ وہ خلافتِ راشدہ تک کے دَور کو صرف اسلامی حکومت کا دَور تصوّر کرتے ہیں اور اس کے بعد تمام مسلمان شاہی خاندانوں کی حکومتوں کو غیر اسلامی حکومتیں قرار دیتے ہیں۔ مگر جہاں تک جاگیرداری اور بڑی زمینداری کا تعلق ہے۔ وہ انہیں اسلامی قانون کے عین مطابق سمجھتے ہیں اس جماعت کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "قرآن کی آیت وضعھا الاحام سے یہ حکم نکالنا کہ زمین کی شخصی ملکیت یعنی زمینداری ناجائز ہے، صحیح نہیں۔ اسی طرح الارض للہ سے یہ اقتناع کہ زمین خدا کی ہے اور بندے اس کے مالک نہیں ہو سکتے، مضحکہ خیز ہے۔

وہ زمین کو بٹائی یا کرائے پر دینے کی ممانعت کے متعلق ان تمام احادیث کو نقل کرتے ہوئے جن کے مروی چھ صحابہ کرام رافع بن خدیج، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، ابوسعید خدری زید بن ثابت اور ثابت بن ضحاک ہیں اور انہیں صحیح اور مستند تسلیم کرتے ہوئے یہ کہہ کر مسترد کرتے ہیں کہ "مزارعت کی حرمت اور یہ خود کاشتی کی قید اور یہ ملکیتِ زمین کے لئے رقبے کی حد بندی اسلام کے مجموعی نظام میں کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی" وہ بڑی زمینداری اور جاگیرداری کے اس قدر حامی ہیں کہ تاریخی حقیقتوں کو بھی غلط انداز میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بڑی زمینداری اور جاگیرداری جزیرۃ العرب میں عہدِ رسالت سے پہلے اور خلافتِ راشدہ کے عہد میں بھی موجود تھی۔ تاریخی اعتبار سے یہ سراسر غلط ہے۔

قدیم عرب اور جاگیرداری

صحرائے عرب بدّو قبیلوں کی سرزمین ہے جو عہدِ رسالت سے پہلے چشموں کے قریب چراگاہوں میں کھجور کے درختوں کے نیچے اونی کپڑے کے خیموں کی بستیوں میں رہتے، رات کے وقت چاند کی چاندنی میں سفر کرتے اور مویشی چراتے، دودھ، گوشت اور کھجور پر زندگی بسر کرتے اور قدیم زمانہ کے تمام صحرائی قبیلوں کی طرح چاند، سورج اور ستاروں نیز چشموں، چراگاہوں، درختوں اور غاروں کو دیوی دیوتا سمجھ کر پرستش کرتے تھے۔ کنوئیں، چشمے، چراگاہیں اور کھجور کے درخت قبیلے کی مشترکہ ملکیت تھے۔ مویشی اور خیمے کے اندر کی چیزیں خاندان کی ملکیت بن چکی تھیں۔ بعض قبیلوں میں مویشی ابھی تک قبیلوں کی مشترکہ ملکیت تھے۔

یمن حضرموت، عمان اور مغربی اور شمالی حجاز کے ان خطوں میں جو سمندر کے قریب ہیں اور جہاں بارش کبھی کبھی ہوتی ہے مزرعی بستیاں اور تجارتی شہر آباد ہو چکے تھے۔ مکہ

جسے زمزم کے چشمے اور کعبہ کی وجہ سے مقدس مقام سمجھا جاتا تھا۔ قریش تاجروں کا شہر
تھا جو کعبہ کے پاسبان بھی گردانے جاتے تھے۔ مدینہ برعکس اس کے زرعی بستی تھا اور
کسانوں دستکاروں اور چھوٹے تاجروں کا قصبہ تھا۔ اوّل الذکر کی آبادی اُس وقت ۷۔
۸ ہزار اور آخر الذکر کی چار پانچ ہزار سے اوپر نہیں تھی۔

صحرائے عرب میں جہاں آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی، خوراک نیز چشموں اور
چراگاہوں کے کم ہونے سے جائے رہائش کی قلت نے عرب قبیلوں کو یکے بعد دیگرے
اپنا آبائی وطن چھوڑنے، مصر، بابل، شام اور فلسطین کو ہجرت کرنے اور وہاں آباد ہو کر پہلی
تہذیبوں کی بنیاد رکھنے کے لئے مجبور کیا۔

چنانچہ ولادت مسیح سے تقریباً چار ہزار سال پہلے یمن کے علاقے سے کچھ صحرائی قبیلے
خوراک کی تلاش میں جزیرۃ العرب کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے دریائے
نیل کی زرخیز وادی میں پہنچے جہاں انہوں نے قدیم مصریوں سے کھیتی باڑی سیکھی اور پتھر
کی عمارتیں تعمیر کر کے نیز شمسی کیلنڈر رائج کر کے سب سے پہلی تہذیب کی بنیاد رکھی۔

اس خروج کے کچھ عرصہ بعد جنوبی عرب کے مشرقی حصوں سے کچھ یمنی عرب قبیلے دجلہ
اور فرات کی زرخیز وادی میں پہنچے جہاں انہوں نے مہذب و متمدن سمریوں سے مکان بنانا
اور اس میں رہنا نیز کھیتی باڑی، آبپاشی اور لکھنا پڑھنا سیکھا۔ بابل کی قدیم تہذیب ان ہی
یمنی عربوں کی تہذیب تھی۔ پہیوں والی گاڑی اور ناپ تول کے پیمانے انہی کی ایجادیں۔

ولادت مسیح سے تقریباً اڑھائی ہزار سال پہلے جنوبی عرب کے اسی خطے سے کچھ
قبیلے خوراک اور زرخیز وادی کی تلاش میں سفر کرتے ہوئے شام و کنعان کے زرخیز خطوں
میں پہنچے۔ یہ فونیشی تھے جنہوں نے بحیرۂ روم میں سب سے پہلے جہازرانی اور سمندری

تجارت شروع کی۔ اس خروج کے تقریباً چھ سات سو سال بعد جنوبی عرب سے کچھ قبیلے دجلہ فرات کی زرخیز وادیوں میں آباد ہونے کی ناکام کوششوں کے بعد فلسطین پہنچ کر آباد ہوئے۔ یہ یہودی تھے جنہوں نے مہذب دنیا کے سامنے ایک خدا کا عقیدہ سب سے پہلے رکھا۔

حضرت مسیح کی ولادت سے تقریباً سات سو سال پہلے شمالی عرب سے خروج کا دور شروع ہوا۔ موجودہ شرقِ اردن کے قریب صحرا سے کچھ قبیلے کوہستان سینا کے شمال مشرق میں پہنچ کر آباد ہوئے اور پہلے مصر اور اس کے بعد روم کی تہذیب سے متعارف اور متاثر ہو کر اپنی ایک الگ تہذیب یعنی قبطی تہذیب کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

خوراک اور جائے رہائش کی قلت نے ہر ملک میں نیم وحشی قبیلوں کو مہذب و متمدن بنانے میں بہت بڑا تاریخی فریضہ ادا کیا ہے۔ یہ خوراک اور جائے رہائش کی قلت ہی تھی جس نے عرب کے ریگستان میں رہنے والے بدو قبیلوں کو ایک دوسرے سے چشمے، چراگاہیں اور مویشی چھیننے کے لئے قبائلی جنگوں میں مصروف رکھا۔ اور یہی وہ تلخ حقیقت تھی جس نے ساحلِ سمندر کے قریب رہنے والے یمنی عربوں کو مچھلی کا شکار کھیلنے کے لئے جہاز سازی اور جہاز رانی اور پھر سمندری تجارت کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ یمنی عرب ہی وہ پہلے تاجر تھے جنہوں نے تہذیبِ قدیم کے تین بڑے مرکزوں، یعنی ہندوستان، عراق اور مصر کے درمیان[1] تجارت شروع کر کے اس پر

---

[1] یمنی عرب ہندوستان سے سوتی کپڑے بالخصوص ململ، خوشبودار تیل اور مرچوں، خلیج فارس کے جزیروں سے موتیوں، چین سے ریشمی کپڑے، حبشہ سے ہاتھی دانت اور غلاموں اور اپنے ملک کے تانبے، زیتون کے تیل اور لوبان کی تجارت، عراق، شام، مصر، ہندوستان اور حبشہ کے درمیان کرتے تھے۔ جزیرۃ العرب کی جنوب مغربی بندرگاہوں سے تاجروں کے قافلے مکہ اور مدینہ سے ہو کر قبطیوں کے دارالحکومت پیٹرا پہنچتے تھے، اور وہاں سے ایک سڑک شام کو، دوسری فلسطین اور لبنان اور تیسری مصر کو جاتی ہے۔

اپنا مکمل اجارہ قائم کیا۔ یمنی عربوں کی یہ اجارہ داری رومیوں نے ختم کی جب اُن کے جہاز دریائے نیل اور اس زمانہ کی نہر سویز[1] سے گذر کر بحیرۂ قلزم کے راستے ہندوستان کو آنے جانے لگے۔ عراق اور ایران میں جہاں ساسانیوں کی حکومت تھی اور شام، فلسطین، مصر اور شمالی افریقہ میں جہاں رومیوں کا اقتدار تھا زرعی اور صنعتی پیداوار کا اکثر وبیشتر انحصار غلاموں کی محنت پر تھا اور دیگر تمام آلاتِ پیداوار کی طرح غلام بھی پیداوار کے اوزار اور مالکوں کی ذاتی ملکیت تھے۔ مگر صحرائے عرب میں جہاں خوراک اور جائے رہائش کی قلت تھی اور جہاں غلاموں کی محنت سے فائدہ اٹھانے کے لئے عربوں کے پاس نہ زرخیز زمین

---

[1] حضرت یسوع مسیح سے تقریباً دو ہزار برس پہلے مصر کے بارھویں شاہی خاندان نے دریائے نیل اور بحیرۂ قلزم کے درمیان ایک نہر اس مقام سے کھدوائی تھی جہاں دریائے نیل سانپ کی طرح بل کھاکر بحیرۂ قلزم کے بہت ہی قریب ہو کر بہتا ہے۔ چنانچہ یمن کی بندرگاہوں سے تاجروں کے قافلے مکّہ اور مدینہ سے گذر کر قلزم کی ایک بندرگاہ القیصر پہنچتے تھے۔ وہاں سے مال تجارت لاد کر جہاز قلزم کو پار کرتے اور پھر اس زمانے کی اس نہر سویز سے گذر کر دریائے نیل کے راستے مصر کے شہروں میں تجارت کا مال اتارتے تھے۔ قدیم مصری تہذیب کے تنزل کے ساتھ ہی ساتھ یہ نہر سویز بھی بند ہوگئی۔ بتولمیوں کے عہد میں جب مصر ایک دفعہ پھر بہت بڑی طاقت بن کر ابھرا تو تیسری صدی قبل مسیح کے وسط میں اس نہر کے راستے سے مالِ تجارت سے بھرے ہوئے جہاز آنے جانے لگے۔ قلزم پر قابو پاکر جہازرانی رومیوں نے شروع کی اور جب ان کے جہاز ہندوستان سے براہ راست تجارت کرنے لگے تو یمنی عربوں کی اجارہ داری ٹوٹ گئی۔ اور تجارت کے تنزل کے ساتھ ہی ساتھ ان کا اقتصادی اور سیاسی تنزل بھی شروع ہوگیا۔

سے بڑے بڑے قطعات اور نہ کارخانے تھے۔ عرب قبیلے اپنے دشمن قبیلوں کو شکست دینے کے بعد ان کی چراگاہوں، چشموں اور مویشیوں پر قبضہ کرکے ان کے خیموں کو لوٹ لیتے اور مردوں کو غلام بنالینے کے بجائے انہیں قتل کر دیتے اور عورتوں کو جن کی تعداد صحرائے عرب میں مردوں کے مقابلے میں کم تھی اپنی لونڈیاں بنالیتے تھے۔ شہروں میں البتہ حبشی غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ یہ غلام یا تو ان کے گھروں میں کام کاج کرتے تھے یا عرب تاجروں کے جہازوں میں چپو چلانے کی محنت کرتے تھے۔ جہاں تک ملک کی زرعی اور صنعتی پیداوار کا تعلق ہے شہروں میں بھی ان کا انحصار غلاموں کی محنت پر نہیں تھا۔ جزیرۃ العرب کے تینوں طرف ساحل سمندر کے قریب بارش والے خطوں میں جہاں زرعی بستیاں وجود میں آچکی تھیں، قابلِ کاشت زمین کے ٹکڑے بہت چھوٹے چھوٹے تھے، اور وہ چھوٹے چھوٹے اور آزاد مالک کاشت کاروں میں بٹ چکے تھے۔ مگر جہاں تک جاگیرداری یا بڑی زمینداری کا تعلق ہے، وہ وجود میں نہیں آئی تھی۔ جاگیرداری کا نشو و نما یمن، حضر موت اور عمان کے خطوں[1] میں بھی نہیں ہوا تھا۔ البتہ وہ چھوٹے چھوٹے کاشت کار جنہوں نے تجارت یا دستکاری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا، ان میں سے بعض اپنی زمین کو کرایہ یا بٹائی پر دوسرے کاشتکاروں کو دے دیتے تھے۔

---

[1] یمن، حضر موت اور عمان میں تیرہ سو سال قبل مسیح سے ۶۵۰ قبل مسیح تک منائی خاندان کی حکومت، اس کے بعد ایک سو سال قبل مسیح تک صابیوں اور پھر ۵۲۵ عیسوی تک بنوحمیر کی حکومت رہی۔ یہ تینوں تاجروں کی حکومتیں تھیں، غلاموں کے آقا جاگیرداروں کی حکومتیں نہیں تھیں۔

خلفائے راشدین اور زرعی اصلاحات

آنحضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد میں زمین کا مسئلہ بہت بڑا مسئلہ بن کر سامنے نہیں آیا اور وہ اس لئے کہ تقریباً سارے کا سارا عرب صحرا ہے اور زرعی بستیوں کی اس صحرا میں حیثیت ساحلِ سمندر کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیروں ایسی ہے۔ آنحضرتؐ کے عہد میں مدینہ ہی صرف چار پانچ ہزار چھوٹے تاجروں، دستکاروں اور کاشتکاروں کی ایک بستی تھا جہاں زمین کا مسئلہ حل کرنے کے لئے پیش ہوا۔

اسلام نے چشموں کنوؤں، چراگاہوں، کانوں وغیرہ کی طرح زمین کو بھی نظری اعتبار سے خدا کی ملکیت اور حقیقی اعتبار سے سب کی مشترکہ ملکیت قرار دیا اور رسولِ کریمؐ نے جیسا کہ چھ صحابہ کرام رافع بن خدیج، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، زید بن ثابت اور ثابت بن ضحاک سے مروی ہے زمین کو قابلِ کاشت بنانے والوں کے حقِ ملکیّت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ وہ اپنے پاس صرف اتنی زمین رکھیں جتنی کاشت کر سکتے ہیں اور باقی زمین اپنے بھائی کو مفت کاشت کے لئے دے دیں مگر بٹائی یا کرایہ پر نہ دیں۔ غرضیکہ مدینہ میں پیغمبر اسلام نے زمین کو خدا کی ملکیت قرار دیتے ہوئے اسے قابلِ کاشت بنانے والے کے حقِ ملکیت کو تسلیم کیا اور ساتھ ہی اس کے حقیقی کاشت کار کو زمین کی پیداوار کا مالک قرار دیا۔

زمین کا مسئلہ حقیقی طور پر بہت بڑا مسئلہ بن کر عربوں کے سامنے اس وقت آیا جب انہوں نے صحرائے عرب سے نکل کر دنیا کے زرخیز ترین خطوں مثلاً عراق، شام فلسطین، مصر اور خراسان پر قبضہ کیا۔

پہلے دو خلفائے راشدین نے مسلمانوں کو جو اس وقت تک عموماً عرب تھے ایک فوجی تنظیم میں منظم رکھنے اور زمینوں پر قبضہ کرکے آباد ہونے سے روکنے کے لئے مفتوحہ ممالک میں زمینوں پر قبضہ کرنے کی خاص طور پر مخالفت کی۔ چنانچہ پہلے دو خلفائے راشدین کے عہد میں حضرت عمر فاروق کی سخت ہدایات کے مطابق عربوں نے پرانی بستیوں اور شہروں سے باہر خیموں کے اپنے الگ شہر آباد کئے اور کسی زمین پر قبضہ نہیں کیا۔

عربوں کی فتوحات سے پہلے ساسانیوں اور رومیوں کی سلطنت کے زرخیز ترین خطوں میں زمین ساسانی اور رومی شاہی خاندان کے ممبروں، ان کے رشتہ داروں درباریوں اور فوجی افسروں کی ملکیت تھی، اور اس کی کاشت ان کے غلام کرتے تھے۔

قدیم زمانے میں غلام داروں کی سلطنتیں اس وقت تک مضبوط و مستحکم رہیں، جب تک ان کے سپہ سالار دوسرے ملکوں کو فتح کرکے وہاں سے دولت اور غلام حکمرانوں کے لئے لاتے رہے۔ مگر فتوحات کا دور ختم ہونے سے جب دولت اور غلاموں کی آمد رک گئی تو غلام شاہی سماج زرعی و صنعتی تنزل اور تجارتی و مالی بحران کے دور میں داخل ہوئی، اور غلاموں اور ان کے آقاؤں کے درمیان طبقاتی جنگ تیز ہو جانے سے ہچکیاں لینے لگی۔ عہدِ رسالت سے پہلے روم و ایران کی قدیم غلام شاہی سلطنتوں کی یہی کیفیت تھی۔ وہ مرض الموت میں مبتلا اور چند دن کی مہمان تھیں۔

جس طرح بربر قبیلوں نے شمال اور شمال مشرق سے حملے کرکے روم قدیم کی غلام شاہی سماج کو یورپ میں درہم برہم کیا تھا، اسی طرح عربوں نے عراق، ایران میں ساسانیوں اور شام، فلسطین لبنان اور مصر میں رومیوں کے غلام شاہی نظام حکومت کو ختم کیا۔

ایک طرف ایران و روم کی زوال پذیر غلام شاہی حکومتوں کی شکست اور دوسری طرف عربوں کے مفتوح ممالک میں زمینوں اور غلاموں کے مالک ساسانی اور رومی حکمرانوں کے مارے جانے، مغلوب ہونے یا بھاگ جانے سے حقیقی کاشت کار غلام اور زرعی غلام آزاد ہو کر زمینوں کے مالک بن گئے۔ پہلے دو خلفاء راشدین کے عہد میں عربوں کے مقابلے میں روم و ایران کی قدیم سلطنتوں کے ریت کی طرح گرنے کا سبب یہی زرعی اصلاحات تھیں۔

جاگیرداری کی نشو و نما

عراق، ایران، شام اور فلسطین میں زرعی اصلاحات کا یہ دور بہت ہی جلد ختم ہو گیا۔ ایک طرف دولت اور لونڈی غلاموں کی کثرت نے اور دوسری طرف عراق، ایران، شام، فلسطین اور لبنان کی خوبصورتی اور زرخیزی[1] نے عرب مجاہدوں کے جوشِ جہاد کو رفتہ رفتہ ٹھنڈا کر کے ان میں دنیا کے ان زرخیز ترین خطوں میں آباد ہونے کی خواہش کو بڑھا دیا۔ عرب شیوخ اور سرکردہ مجاہدین نے حضرت عمرؓ کے عہد میں ہی مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ مفتوحہ ممالک میں عربوں کو زمینوں پر قبضہ کرنے اور انہیں خریدنے کی اجازت دی جائے مگر وہ اپنے انکار پر ہمیشہ مصر رہے۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان نے جو مکہ کے اموی امراء سے تعلق رکھتے تھے، جہاں کلیدی محکمے

---

[1] یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ابو عبیدہ کی سپہ سالاری میں عرب مجاہدین شام و فلسطین کو فتح کر کے جب لبنان پہنچے اور اسے قبضہ میں لے لیا تو اس ملک کے خوبصورت باغات کو دیکھ کر عربوں نے کہا کہ "جس جنت کا خدا نے وعدہ کیا تھا وہ یہی ہے" اور فتوحات کو آگے جاری رکھنے سے انکار کر دیا۔

اور عہدے اپنے قریبی رشتہ دار اموی اُمرا کے حوالے کر دیئے وہاں ان کے نور دینے سے عربوں کو مفتوحہ ممالک میں زمینوں پر قبضہ جمانے اور عالیشان محلوں میں رہنے کی بھی اجازت دے دی۔ کئی ایک صحابہ کرامؓ بالخصوص حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس بات کی شدید مخالفت کی۔ مگر حضرت عثمان نے اس مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے حضرت ابوذر غفاری کو مدینہ سے کچھ دُور ربزہ میں نظر بند کر دیا۔

زمینیں اور جاگیریں حاصل کر کے زرخیز ترین علاقوں میں آباد ہونے کی طرف رجحان بڑھنے سے فتوحات کا پہلا دَور حضرت عمر کی وفات (۶۴۴ھ) کے تین چار سال بعد ہی ختم ہو گیا۔ صحرائے عرب سے جہاں خوراک اور جائے رہائش کی قلت اور آبادی بڑھ رہی تھی، یکے بعد دیگرے قبیلے نکل کر دوسرے علاقوں میں آباد ہونے لگے اور چالیس پچاس سال کے عرصے میں صحرائے عرب میں آبادی بہت کم رہ گئی۔

زمین اور جاگیریں عطا کرنے کا سلسلہ حضرت عثمان کے عہد میں شروع ہوا۔ ابن خلدون مقدمہ تاریخ جلد دوم صفحہ ۶۰ پر بحوالہ مسعودی لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کے زمانے میں ہی صحابہ کرام اور اموی اُمرا جاگیریں اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کے سبب سے امیر و کبیر ہو گئے تھے۔ خود حضرت عثمان کی شہادت کے بعد اُن کے خزانے میں ایک لاکھ دینار اور دس ہزار درہم موجود تھے۔ حضرت زبیرؓ کے انتقال کے بعد ان کے ترکے کی قیمت پچاس ہزار دینار تھی۔ علاوہ اس کے ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار لونڈی غلام بھی تھے۔ حضرت طلحہؓ کی عراق میں غلہ کی تجارت تھی اور اس سے ان کی آمدنی ایک ہزار دینار یومیہ تھی۔ حضرت عبدالرحمانؓ بن عوفؓ کے اصطبل میں ایک ہزار گھوڑے ایک ہزار اونٹ اور دس ہزار بکریاں تھیں اور ان کی

وفات کے بعد اُن کا ترکہ ۴۸ ہزار دینار تھا۔ زید بن ثابتؓ نے ایک لاکھ دینار کی جاگیر اور بہت کچھ نقدی چھوڑی تھی۔ چاندی اور سونے کی اینٹیں اس کے علاوہ تھیں۔

غرضیکہ حضرت عثمان کی وفات سے پہلے اموی گورنروں اور فوجی افسروں نے خود زمینوں پر قبضہ کر کے اور قبائل سرداروں اور سرکردہ مجاہدین کو زمینیں اور جاگیریں عطا کر کے تھوڑے ہی عرصہ میں جاگیرداروں، جاہ پسند گورنروں اور فوجی افسروں کا ایک ایسا با اثر اور مضبوط طبقہ پیدا کر دیا جس کا علویوں اور زبیریوں کے خلاف بنوامیہ کو برسر اقتدار لانے میں بہت بڑا حصہ ہے۔

پہلے دو خلفاء راشدین نے عراق، ایران، شام اور فلسطین کے کاشت کاروں اور زرعی غلاموں کو ان کے ساسانی یا رومی آقاؤں کی غلامی سے آزاد کر کے زمینوں کا مالک بنا دیا، اور اُن سے وہی خراج (مالیۂ زمین جو پیداوار کے ایک مقررہ حصہ کی شکل میں حکومت وصول کرتی تھی) وصول کرنے کا فرمان جاری کیا جو ان علاقوں کے مالک کاشت کار رومی یا ساسانی حکومتوں کو ادا کرتے تھے۔ حضرت عثمان کے عہد سے زمینیں اور جاگیریں ملنے سے عربوں میں جو جاگیردار پیدا ہوئے وہ مالک نہیں تھے۔ حکومت نے صرف انہیں مخصوص علاقوں یا ضلعوں میں کاشت کاروں سے خراج وصول کر کے اپنے ذاتی استعمال میں لانے اور حکومت کو اس میں سے کوئی حصہ نہ دینے کا حق دیا تھا۔ نظری اعتبار سے زمین خدا کی ملکیت رہی۔ تبدیلی صرف یہ ہوئی کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے خلیفہ اور ملک کے فرمانروا کی حیثیت سے خدا کی طرف سے زمینوں کا مالک خلیفۂ وقت قرار پایا۔ چنانچہ خلیفۂ وقت آج کسی کو اگر کسی علاقہ یا ضلع کا خراج وصول کرنے کا حق عطا کرتا تھا تو کل ناراض ہو کر اس سے یہ حق چھین بھی لیتا تھا۔ مثلاً امام حسنؑ پچاس لاکھ درہم

سالانہ وظیفہ اور ایران کے ایک ضلع کا خراج وصول کرنے کا حق قبول کر کے امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوئے مگر بہ حق اموی تاجداروں نے بعد میں امام حسنؑ کے خاندان سے چھین لیا۔

آمدنی کے وسیلے اور مالی بحران

غرضیکہ عرب جاگیردار زمینوں کے مالک نہیں تھے۔ وہ خراج وصول کرتے تھے اور حکومت کو اس خراج میں سے کچھ نہیں دیتے تھے۔ یہ نظام ایک عبوری دور کا نظام تھا جو جلدی ہی اقتصادی مشکلات کے چنگل میں پھنس گیا۔ کیونکہ اس دور میں عربوں اور ان کی حکومت کی آمدنی کے وسیلے محدود تھے۔

آمدنی کا ایک وسیلہ مالِ غنیمت تھا۔ دشمنوں کا تمام مال و متاع حتیٰ کہ وہ خود ان کی عورتیں اور فوجی سپاہی سب مال غنیمت تھے۔ اس مالِ غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے چار حصے مالِ غنیمت۔ ان مجاہدوں میں تقسیم کیا جاتا تھا جنہوں نے فتح حاصل کر کے سب مال و متاع لوٹا ہو اور باقی ایک حصہ قومی خزانے یعنی عملی طور پر فرمانروا کو بھیجا جاتا تھا۔ حضرت عثمان کے بعد فتوحات کا سلسلہ رک جانے سے عربوں اور ان کی حکومت دونوں کی اس وسیلے سے آمدنی گھٹنی شروع ہوئی۔ منڈیوں میں غلاموں اور کنیزوں کی آمد اور خرید و فروخت بھی رک گئی اور اس سے تجارتی بحران پیدا ہو گیا۔

دوسرا وسیلہ خراج تھا جو مسلم اور غیر مسلم سب کاشت کاروں سے حکومت وصول کرتی تھی حضرت عثمان کے عہد سے عربوں نے بہت بڑے پیمانے پر عرب کے ریگستان سے نکل کر عراق، ایران، شام، فلسطین اور مصر میں آباد ہونا شروع کیا اور

بنو امیہ نے خلافت کے دوسرے دعویداروں یعنی اوّل حضرت علی کے فرزندوں اور پھر حضرت زبیرؓ کے فرزند عبداللہؓ کے مقابلے میں عربوں کی زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرکے انہیں شکست دینے کے لئے لاتعداد قبائلی سرداروں اور کئی ایک صحابیوں کو جاگیریں دے کر خراج وصول کرنے کے حق دے دیئے[1] جس سے اس وسیلے سے حکومت کی آمدنی بھی رفتہ رفتہ گر گئی۔

تیسرا وسیلہ جزیہ کے نام سے وہ سرکاری ٹیکس تھا جو غیر مسلموں سے ان کے جان و مال کی حفاظت کرنے کے صلہ میں وصول کیا جاتا تھا۔ کچھ تبلیغ سے، کچھ جزیہ کی ادائیگی سے معافی حاصل کرنے کی غرض سے اور کچھ وہ حقوق و مراعات حاصل کرنے کے لیے جو مسلمانوں کو حاصل تھے جب غیر مسلم بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنے لگے تو اس وسیلے سے آمدنی بھی لگاتار گرنے لگی۔

یعقوبی نے "کتاب البلدان" میں حکومت کی آمدنی گرنے سے متعلق چند حقائق بیان کئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: مصر جس کی آمدنی عمرو بن عاص کے زمانہ میں ایک کروڑ چالیس لاکھ دینار تھی صرف پچاس لاکھ دینار رہ گئی۔ حضرت عمر فاروق کے عہد خلافت میں عراق کی آمدنی دس کروڑ دینار تھی۔ عبدالمالک کے عہد تک گر کر صرف چار کروڑ دینار رہ گئی۔

غرضیکہ حکومت کی آمدنی کم ہو رہی تھی اور اس کے مقابلے میں فوج اور نظم و نسق

---

[1] حضرت علی کے خلاف جد و جہد میں حمایت کرنے کے صلہ میں امیر معاویہ نے عمرو بن عاص کو نہ صرف مصر کا پھر گورنر بنا دیا تھا بلکہ اسے مصر کی تمام آمدنی خرچ کرنے اور اس آمدنی میں سے مرکزی حکومت کے خزانہ میں ایک پیسہ تک نہ بھیجنے کے بھی اختیارات دے دیئے تھے۔

کے مصارف میں اضافہ اور اموی شہزادوں اور شاہی خاندان کے ممبروں، گورنروں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کے وظیفوں اور تنخواہوں کی رقومات نیز وظیفہ لینے والے خاندانوں قبیلوں اور قبائلی سرداروں کی تعداد بڑھنے سے حکومت کے اخراجات بڑھ رہے تھے۔ یہی حال عربوں کی انفرادی آمدنی اور خرچ کا تھا۔ مال غنیمت کی آمد رک جانے سے عربوں کی آمدنی گھٹ رہی تھی اور منڈیوں میں غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت کم ہو جانے سے تجارتی بحران بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آخر میں بنو امیہ کے ماتحت عرب سماج تجارتی بحران اور مالی مشکلات میں مبتلا تھی اور ان پر قابو پانے کے لئے اموی حکمرانوں نے آٹھویں صدی کے شروع میں شام میں آباد یمنی عربوں عراق میں آباد حجازی عربوں اور شمالی افریقہ کے بربر قبیلوں کے افراد پر مشتمل تنخواہ دار فوج کے بل بوتے پر فتوحات کے دوسرے دور کا آغاز کیا۔

پانچویں اموی خلیفہ عبدالملک (۶۸۵ء تا ۷۰۵ء) کے عہد میں قطیبہ بن مسلم نے ۷۰۳ء میں دریائے آموں پار کر کے دس سال کے عرصہ میں دریائے سیحون (دریائے سر) تک تمام وسط ایشیا فتح کر لیا۔ محمد بن قاسم نے ۷۱۰ء میں بلوچستان اور سندھ کو فتح کیا اور ۷۱۳ء میں سلطنت بنو امیہ کی حدود ملتان تک وسیع کر دیں۔ اسی طرح موسیٰ بن نصیر اور طارق کی سرکردگی میں اموی فوجیں ۷۱۱ء میں مغربی افریقہ کو فتح کر کے سپین میں داخل ہوئیں اور ۷۲۰ء تک تمام ہسپانیہ بنو امیہ کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

مالی مشکلات پر قابو پانے کے لئے دوسرا قدم خلیفہ الولید اول (۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) نے اٹھایا۔ اس نے عرب جاگیرداروں سے خراج کا کچھ حصہ بطور مالیہ لینا شروع کیا اور جاگیرداروں نے اس ٹیکس کا بوجھ خراج کی شرح بڑھا کر مسلم اور غیر مسلم

کاشت کاروں کے کندھوں پر ڈال دیا۔ تیسرا قدم اس خلیفہ کے عہد میں عراق، حجاز اور ایران کے گورنر حجاج بن یوسف نے اٹھایا۔ اس نے عراق اور ایران میں عربوں کے علاوہ باقی سب کو جزیہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ خراج کی شرح میں اضافہ سے کاشت کاروں میں بے چینی پھیل رہی تھی۔ جزیہ ادا کرنے کے حکم نے غیر مسلم اور غیر عرب مسلم کی تمیز کو ختم کر کے سب کاشت کاروں کو جزیہ اور خراج دونوں کی ادائیگی سے انکار کر دینے کی بنیادوں پر متحد کر دیا۔ حجاج بن یوسف نے خراج اور جزیہ وصول کرنے کے لئے تعزیری فوج بھیجی جس نے عراقی کاشت کاروں کی بغاوت کو دبانے کے لئے ڈیڑھ لاکھ کاشت کاروں کو ہلاک اور لاکھوں کو گرفتار کر کے جیل میں قید کر دیا۔ تحریک انتہائی تشدد کے باوجود سات آٹھ سال جاری رہی اور امن اس وقت قائم ہوا جب ساتویں اموی خلیفہ سلیمان نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی جیل میں قید کاشت کاروں کو رہا کر دیا اور آٹھویں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (۷۱۷ء تا ۷۲۰ء) نے مسلمانوں سے جزیہ کی وصولی منسوخ کر دی اور کاشت کاروں سے خراج وصول کرنے کے جاگیر نامے اور سندیں اپنے عزیز و اقارب، شاہی خاندان کے ممبروں درباریوں، فوجی افسروں اور قبائلی سرداروں سے لے کر پھاڑ دیئے۔ اموی شہزادے اور اموی امرا خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی ان سرگرمیوں کو برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ کھانے میں زہر دے کر انہوں نے انہیں ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا اور جاگیرداری سے نجات کا یہ مختصر سا دور ختم ہو گیا۔ ۹ ویں اموی خلیفہ یزید ثانی (۷۲۰ء تا ۷۲۴ء) اور دسویں خلیفہ ہشام (۷۲۴ء تا ۷۴۳ء) کے عہد میں جاگیرداروں کو ان کے حقوق اور جاگیر نامے پھر مل گئے۔ فرق صرف یہ ہوا کہ عرب اور غیر عرب نیز مسلم اور غیر مسلم کاشتکاروں

اور جاگیرداروں سے زرعی پیداوار کا جو مقررہ حصہ بطور مالیہ حکومت وصول کرتی تھی وہ خراج کہلانے لگا اور پیداوار کا جو مقررہ حصہ کاشتکاروں سے جاگیردار وصول کرتے تھے۔ اسے مالکانہ، کرایہ، بٹائی لگان وغیرہ کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ چنانچہ کاشتکاروں سے کرایہ بٹائی وغیرہ لینے کے سوال پر فقیہوں میں بحث کا آغاز ہوا۔

امام مالک (۷۱۵ء تا ۷۹۵ء) نے جو مدینہ کے رہنے والے تھے، اور جنہوں نے تمام سیاسی اور مذہبی متنازعہ فیہ مسائل کو حل کرنے، نیز فقہ کو مرتب کرنے کے لئے رسالت اور خلافتِ راشدہ کے عہد میں اہل مدینہ کی عملی زندگی کو سامنے رکھا تھا، کاشتکاروں سے کرایہ یا بٹائی لینے کی مخالفت کی۔ یہی رائے امام ابو حنیفہ (سالِ وفات ۷۶۷ء) کی تھی جو ایک ایرانی غلام کے پوتے، کوفہ کے ایک تاجر کے فرزند اور امام حسن بصری کے شاگرد تھے اور جنہوں نے آیاتِ قرآنی کی تفسیر و تشریح نیز احادیث کی صداقت کو پرکھنے اور فقہ مرتب کرنے کے لئے عقل اور استدلال پر زیادہ زور دیا تھا۔ کاشتکاروں سے بٹائی لینے کی مخالفت امام شافعی نے بھی کی جو امامِ مالک کے شاگرد تھے اور جنہوں نے جہاں حدیث مبہم اور غیر واضح ہو وہاں قیاس و استدلال کو جائز قرار دیا تھا مگر بنو عباس کے عہد میں جاگیرداری نظام اس قدر مضبوط ہو چکا تھا کہ امام ابو حنیفہ کے شاگرد اور پانچویں عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں بغداد کے قاضی القضات امام ابو یوسف نے حنفی فقہ میں خدا کو بدستور زمین کا مالک تسلیم کرتے ہوئے کاشتکاروں سے پیداوار کا ایک مقررہ حصہ بطور لگان یا بٹائی لینے کو جائز قرار دیا اور فقہ کی اس پر مہر ثبت کر دی۔

فقہ اور جاگیرداری

غرضیکہ جزیرۃ العرب میں جاگیرداری نظام نہ عہدِ رسالت سے پہلے تھا اور نہ عہدِ رسالت اور پہلے دو خلفائے راشدین کے عہد میں - احادیث میں زمین کو کرائے یا بٹائی پر دینے کی مخالفت کا سبب یہی ہے - عربوں میں جاگیرداری کی نشو و نما اس وقت ہوئی جب انہوں نے دوسرے ملکوں کو فتح کر کے عراق، ایران، شام، فلسطین اور مصر وغیرہ کی زرخیز زمینوں پر قبضہ کیا۔

یونان قدیم میں جب غلام داری ایک حقیقت بن گئی تو افلاطون نے اپنی "جمہوریت" میں جس مثالی جمہوریت کا خاکہ پیش کیا، وہ محض غلام داروں کی جمہوریت کا تھا، اور اس میں غلاموں کو وہی جگہ دی جو عملی زندگی میں اس وقت انہیں یونان میں حاصل تھی۔ اسی طرح عباسیوں کے دور میں جاگیرداری نظام اُبھر کر ایران، عراق، شام مصر، سپین اور وسط ایشیا میں ایک حقیقت بن گیا، تو نہ صرف امام ابو یوسفؒ بلکہ امام مالکؒ امام حنبلؒ اور امام شافعیؒ کے پیروکاروں نے بھی اس نظام کو اپنی فقہ میں اپنا لیا۔ انہوں نے زمین کو بدستور خدا کی ملکیت قرار دیا۔ مگر ساتھ ہی اس کے جاگیرداروں کو کاشتکاروں سے کرایہ یا بٹائی لینے کا حق دے دیا۔ عربوں کے اقتصادی حالات بدلے تو اُن کے باہمی تعلقات بدل گئے اور ان کے بدلتے ہی سیاسی، اخلاقی اور مذہبی تصورات اور قانون بدل گئے۔ جاگیرداری نظام ایک خاص اقتصادی سیاسی اور سماجی نشو و نما کا پرتو ہے۔ نہ ہمیشہ سے موجود ہے اور نہ ہمیشہ قائم رہے گا۔

مگر جماعتِ اسلامی کے مولوی جاگیرداری اور بڑی زمینداری کو قائم رکھنے کے لئے

اس بات پر بضد ہیں کہ جاگیرداری نظام ایک "فطری" نظام ہے۔ روزِ اوّل سے موجود ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ عہدِ رسالت سے پہلے یہ نظام عربوں میں موجود تھا، اور حضرت رسولِ اکرم اور خلفاء راشدین نے اسے قائم رکھا۔

ایشیا میں جاگیرداری نظام کی خصوصیات

مولانا مودودی اپنی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں زمین کی انفرادی ملکیت کو اسلام کے اقتصادی نظام کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن تاریخ کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو کارل مارکس کے اس نظریے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ:

"مسلمانوں نے سارے ایشیا میں زمین کو نجی ملکیت نہ بنانے کے اصول کو وسیع پیمانے پر عملی جامہ پہنایا تھا۔"

مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے فرانیسی ڈاکٹر برنیر کے سفرنامہ، ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنروں اور ملازموں کی تحریریں، تاریخ فرشتہ، ابن بطوطہ کے سفرنامہ، نیز کیلورٹ کی کتاب "ویلتھ اینڈ ویلفیئر آف دی پنجاب" کا مطالعہ کرنے سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مغربی استعمار پرستوں کے تسلط سے پہلے سارے ایشیا میں زمین کسی کی ملکیت نہیں تھی، اس کی کوئی قیمت نہیں تھی، اس کی کوئی ساکھ نہیں تھی۔ گاؤں کی پنچائت ہر کسان کو اس کے خاندان کی ضرورت کے مطابق زمین دینے، گاؤں کا سارا انتظام کرنے، دست کاروں کو رواج کے مطابق پیداوار کا مقررہ حصہ دینے، گاؤں کے باشندوں کے باہمی جھگڑے نپٹانے اور سارے کے سارے گاؤں کی طرف

۱؎ سوشلسٹ بک کلب الہ آباد کی طرف سے شائع شدہ کتاب "مارکس اینڈ اینگلز آن انڈیا" صفحہ ۷

سے ملک کے فرمانروا کو ملک کے قانون یا رواج کے مطابق پیداوار کا مقررہ حصہ مالیہ کی حیثیت سے ادا کرنے کے فرائض ادا کرتی تھی۔ زمین وسیع تھی، لہذا اسے زیر کاشت لانے میں ملک کا کوئی قانون، کوئی رواج، کوئی اخلاق اور کوئی مذہبی عقیدہ مانع نہ تھا۔ پیداوار کے البتہ دو حصہ دار تھے ایک کاشت کار اور دوسرا ملک کا فرمانروا جسے سروکار صرف مالیہ وصول کرنے سے تھا۔ حکمران بدلتے رہے۔ کبھی عرب، کبھی ترک، کبھی تاتار اور منگول مگر دیہاتی نظام بنیادی طور پر جوں کا توں رہا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہندوؤں کے عہد میں مالیہ کل پیداوار کے بارھویں حصے سے چھٹے حصے تک تھا، اور شہنشاہ اکبر کے وزیر مال ٹوڈرمل نے کل پیداوار کا ایک تہائی حصہ مقرر کیا تھا۔

مغربی استعمار پرستوں کے تسلّط سے پہلے سارے ایشیا میں زمینوں کے مالک بڑے بڑے جاگیردار بھی نہیں تھے۔ کاشت کاروں اور ملک کے فرمانروا کے درمیان البتہ وفادار راجواڑوں، نوابوں، خانوں، شاہ کے خیر خواہ اور پرانے خدمت گار افسروں دیوانوں اور قبائلی سرداروں کا ایک طبقہ ضرور تھا جو فرمانروا کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے علاقے کی حفاظت اور اس کا انتظام کرتا تھا اور ساتھ ہی اس کے کاشت کاروں سے مالیہ وصول کر کے اس میں سے کچھ مقامی ضرورتوں (حفاظت نظم و نسق اور تعمیر) کے لئے مقامی خزانہ میں رکھتا اور باقی فرمانروا کو بھیج دیتا تھا۔ ان تینوں میں زمین کا حقیقی مالک کون ہے؟ اس بات کا تصفیہ جدید سرمایہ داری کے عروج کے ساتھ ہی ساتھ یورپ میں دو تین سو سال پہلے ہو چکا تھا، ایشیا میں نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ زمین ہندوستان اور تمام ایشیا میں کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی۔ اس

کی کوئی قیمت نہ تھی، اس کی کوئی ساکھ نہ تھی۔

جدید سرمایہ داری اور ایشیا کے جاگیردار

مگر یورپ کے جدید تاجر پچھلے تمام حکمرانوں سے جدا خصوصیات رکھتے تھے۔ جدید تاجر ہونے کی حیثیت سے ان کا مقصد اپنے ملک کے کارخانوں کے لئے کچا مال خریدنا اور ان کارخانوں کی تیار کردہ اشیاء کو فروخت کرنا تھا۔ ایشیا کا قدیم خود کفیل دیہاتی نظام ان کے اس مقصد کی کامیابی میں حائل ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اسے درہم برہم کرکے اپنے مفاد کے مطابق ایک خاص نظام یعنی نو آبادیاتی نظام قائم کیا۔

خود ہمارے اپنے ملک میں پہلے مالیہ کی ادائیگی گاؤں کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ اس اعتبار سے زمین گاؤں یا قبیلہ کی مشترکہ ملکیت تھی۔ نئے حکمرانوں نے مالیہ ادا کرنے کی ذمہ داری افراد کے کاندھوں پر ڈال کر گاؤں یا قبیلہ کی مشترکہ ذمہ داری ختم کردی۔ زمین کو ذاتی ملکیت بنانے کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ پہلے مالیہ کل پیداوار کا ایک مقررہ حصہ تھا اور عموماً جنس کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا۔ انگریز حکمرانوں نے رقبہ اور زمین کی زرخیزی کو مالیہ کی بنیاد بنایا اور نقد روپوں کی ادائیگی کو قانوناً لازمی اور عدم ادائیگی کو جرم مستوجب ضبطی زمین قرار دیا۔ روپیہ اس زمانہ میں شاذونادر ہی نظر آتا تھا۔ اس لئے جو کسان مالیہ ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے، وہ اپنے قبائلی سرداروں اور سابقہ اور نئی حکومت کے سرکاری افسروں کے مزارعہ بن گئے۔ چنانچہ قبیلوں کے قبیلے اور گاؤں کے گاؤں کی مشترکہ زمین ان قبائلی سرداروں سابقہ حکومتوں کے ملازموں اور افسروں پیروں اور سجادہ نشینوں کے قبضہ میں چلی گئی، جنہوں نے سابقہ حکمرانوں کے خلاف

بغاوت کر کے نئے حکمرانوں کو ملک فتح کرنے میں مدد دی یا سرکش قبیلوں کو دبانے میں انگریزوں کا ہاتھ بٹایا، یا عوام کے خلاف حکومت کی بڑی خدمت کی اور یہ حقیقت ہے کہ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد میں آج جو بڑے بڑے زمیندار اور جاگیر دار ہیں انہیں یہ جاگیریں اور زمینیں وطن فروشی اور عوام دشمنی کے صلے میں انگریزوں سے ملی ہیں۔

عوام کو ایک پس ماندہ نو آبادیاتی نظام کی زنجیروں میں جکڑنے نیز اپنے اس نظام کو عوامی غصہ کے پُرشور طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لئے انگریزوں کو ہندوستانیوں کے ایک حصہ کی سرگرم اور وفادارانہ حمائت و امداد درکار تھی۔ چنانچہ انہوں نے زمانہ گذشتہ کی باقیات (راجے، نواب، قبائلی سردار، پچھلے حکمرانوں کے افسر، پیر، سجادہ نشین وغیرہ) نیز اپنے خدمت گاروں، وفاداروں اور عوام دشمن عناصر میں سے جاگیردار پیدا کر کے انہیں اپنی حکومت اور نو آبادیاتی نظام کا ستون بنایا اور زمین (خدمات کے صلہ میں مربعہ جات) مخصوص مراعات (مثلاً ٹوانوں اور نُونوں کو اپنی نہریں جاری رکھنے اور کاشت کاروں سے کُل پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ آبیانہ وصول کرنے نیز تمام جاگیرداروں کو اپنے مزارعوں سے مختلف قسم کے جاگیرشاہی ٹیکس وصول کرنے کی مراعات) خطابات اور سندیں (جو مقامی افسروں سے رعایات حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں) اور اختیارات (نمبرداری، ذیلداری، آنریری مجسٹریٹی وغیرہ) دے کر اور ان کے پڑھے لکھے بیٹوں اور بھتیجوں کو فوج، پولیس، مال، نہر اور دیگر سرکاری محکموں میں اونچے اونچے عہدے دے کر مصنوعی طریقہ پر قائم رکھا ہے۔

جاگیرداری اور جماعت اسلامی

مغربی پنجاب اور اسی طرح سندھ، صوبہ سرحد، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے حقیقی مالک اور حکمران یہی جاگیردار اور بڑے زمیندار ہیں۔ مثلاً مغربی پنجاب کے ساڑھے تیرہ لاکھ موجودہ پرانے مالکان اراضی میں سے دس ایکڑ سے کم زمین کے مالک گیارہ لاکھ ۳۲ ہزار اور پانچ ایکڑ سے کم زمین کے مالک نو لاکھ سے اوپر ہیں۔ مگر اس صوبہ کی زیر کاشت تقریباً دو کروڑ ایکڑ زمین میں سے مجموعی طور پر ان کے قبضہ میں بالترتیب ۴۳ لاکھ اور ۱۸ لاکھ ایکڑ زمین ہے۔ برعکس اس کے پانچ سو ایکڑ سے زیادہ زمین کے مالک ساڑھے سات ہزار سے کم ہیں۔ مگر مجموعی طور پر زمین ان کے قبضہ میں ۳۶ لاکھ ایکڑ ہے۔ مغربی پنجاب کے حقیقی مالک اور حکمران یہی چھ سات ہزار زمینداروں اور جاگیرداروں کے خاندان ہیں۔ دس ایکڑ سے کم زمین رکھنے والے تقریباً گیارہ لاکھ مالک، مہاجر کاشتکاروں کے تقریباً پانچ لاکھ خاندان جنہیں غیر مسلم کی زمینوں پر آباد کیا گیا ہے، علاوہ ان کے مزارعوں اور کھیت مزدوروں کے تقریباً پانچ لاکھ خاندان یعنی مہاجر اور غیر مہاجر دیہاتی کاشتکاروں کے تیرہ چودہ لاکھ خاندان ——— غرضیکہ پوری کی پوری دیہاتی آبادی ان کی غلام ہے۔

پہلے یہ بڑے زمیندار اور جاگیردار یونینسٹ پارٹی کے ممبر اور ستون تھے، اب مسلم لیگ کے ہیں، پہلے وہ صرف زمیندار اور جاگیردار تھے اب ان میں سے کئی ایک نے غیر مسلم کی آڑھت کی دکانوں، تجارتی فرموں اور کارخانوں پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ ہماری دیہاتی اقتصادیات پہلے ہی ان کے قبضہ میں تھی اب قصباتی اقتصادیات پر بھی ان کا قبضہ

ہو گیا ہے۔

جس خطۂ زمین کے چند ہزار بڑے زمیندار اور جاگیر دار تقریباً چالیس فیصدی زمین کے مالک ہوں اور پیداوار میں کوئی سرمایہ اور کوئی محنت صرف کرنے کے بغیر اپنی زمین کی پیداوار کے تقریباً دو تہائی حصہ کے مالک بن جاتے ہوں، جس خطۂ زمین کے چوبیس لاکھ حقیقی کاشت کار خاندانوں میں سے تقریباً گیارہ بارہ لاکھ مزارعہ اور مہاجر کاشت کار خاندانوں کو خون پسینہ ایک کرنے کے علاوہ اخراجات کا سارا بوجھ برداشت کر کے بھی ایک تہائی پیداوار سے کم نصیب ہوتی ہو۔ جس خطۂ زمین کے تیرہ چودہ لاکھ دیہاتی دستکار بے روزگاروں کی صف میں کھڑے ہوں، جس خطۂ زمین کے زمیندار اور جاگیردار آڑھتی اور تاجر بن کر ذخیرہ بازی، چور بازاری اور نفع خوری میں غیر مسلم آڑھتیوں اور تاجروں کو بھی شرمندہ کر رہے ہوں اور جس خطۂ زمین کے زمیندار اور جاگیر دار کارخانوں کے مفت میں مالک بن کر صنعت کو فروغ دینے کے بجائے مزدوروں کا خون چوس کر اور مشینیں فروخت کر کے دولت جمع کر رہے ہوں، اس خطۂ زمین کی زراعت، تجارت اور صنعت کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس خطۂ زمین کے عوام کبھی خوشحال نہیں ہو سکتے اور فوج رکھنے کے باوجود اپنے ملک کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جاگیرداری نظام جو ایک ہزار سال پہلے ترقی پسندانہ نظام تھا (اسی وجہ سے اس نے غلامی کے نظام کی جگہ لی تھی) آج اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی ترقی کے راستہ میں پہاڑ بن کر کھڑا ہے۔ اس پہاڑ کو گرانے یعنی جاگیرداری اور بڑی زمینداری کو بلا معاوضہ منسوخ کرنے اور زمینوں کو ملک کے حقیقی کاشت کاروں میں مفت تقسیم کرنے کے بغیر ہم ترقی کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے۔

مگر مولانا مودودی کسی حکومت یا کسی مجلس قانون ساز کو اجتماعی بہتری کے لئے بھی جاگیرداروں کے مالکانہ حقوق کو چھیننے یا ان میں کمی بیشی کرنے کو شرعاً ناجائز اور ظلم قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں :

"جو لوگ جاگیرداری کو ناجائز ٹھہرا کر اس کے انسداد پر زور دیتے ہیں وہ اسلامی قانون کی حدود سے باہر قدم رکھتے ہیں" (تسنیم ۲۶ جون ۵۰ء)

مولانا مودودی نہ صرف بڑی زمینداری اور جاگیرداری کو اسلامی قانون کے عین مطابق سمجھتے ہیں، بلکہ قدیم زمانہ کے جاگیرداری نظام کی دوسری "برکتوں" مثلاً "جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے" ان کی خرید و فروخت کرنے اور بلاتعداد لونڈیوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کی بھی حمایت کرتے ہیں ۔ اسلامی حکومت کے متعلق جماعت اسلامی کے اس تصوّر اور مطمع نظر پر روشنی مولانا مودودی نے ایک چٹھی میں ڈالی ہے جو نومبر ۱۹۴۸ء کے "طلوع اسلام" اور ۲۶ جولائی ۱۹۵۰ء کے روزنامہ "امروز" میں شائع ہوئی تھی۔[1]

غرضیکہ جماعت اسلامی کے قائم کردہ اسلامی نظام حکومت میں بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کو نہ صرف کسانوں اور مزارعوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو ہڑپ کرنے

---

[1] مولانا مودودی سے کسی نے پوچھا تھا کہ جماعت اسلامی جو اسلامی نظام حکومت قائم کرنا چاہتی ہے کیا اس میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت ہوگی ؟ کیا ان لونڈی غلاموں کو فروخت کرنے کا حق حاصل ہوگا؟ کیا ان لونڈیوں سے بیویوں کے علاوہ تمتع جائز ہوگی اور اس پر تعداد کی کوئی قید تو نہیں ہوگی ؟ ان استفسار کے جواب میں مولانا مودودی نے جو چٹھی لکھی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے کہ جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانا اور ان کی خرید و فروخت کرنا اور بلاتعداد لونڈیوں سے جنسی تعلقات قائم کرنا شریعتِ حقہ کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اسلام کے لئے وجہِ فخر ہے ۔

بلکہ لونڈی غلام خریدنے اور فروخت کرنے اور بلا تعداد لونڈیوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کا بھی حق ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب اور سندھ کے بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار مسلم لیگی ہونے کے باوجود جماعت اسلامی کے پرستار ہیں۔ مالی امداد کرتے ہیں لٹریچر خریدتے ہیں۔ کاشت کاروں میں تقسیم کرتے ہیں اور زرعی اصلاحات کے خلاف پنجاب کے جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے نمائندے سید نوبہار شاہ مولانا مودودی کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں۔

سرمایہ داری اور جماعت اسلامی کی "متوسط راہ"

جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جاگیرداری کو اسلامی قانون کی رُو سے جائز قرار دیتے ہوئے اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کی مذمت کرتے ہیں۔ مگر جو اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی نظام "اسلام کے نظام حیات" کے نام سے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان ایک "متوسط راہ" کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں وہ کوئی دوسری راہ نہیں، وہی راہ ہے جس پر کہ سرمایہ دار اور جاگیردار موجودہ دور میں گامزن ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

> "تمدن و معیشت میں انسان کو جو چیز اپنی انتہائی قوت کے ساتھ سعی و عمل کرنے پر ابھارتی ہے، وہ دراصل اس کا ذاتی مفاد ہے۔ یہ انسان کی فطری خود غرضی ہے جس کو کوئی منطق اس کے دل و دماغ کے ریشوں سے نہیں نکال سکتی، غیر معمولی افراد کو چھوڑ کر ایک اوسط درجہ کا آدمی اپنے دل و دماغ اور دست و بازو کی تمام طاقتیں صرف اسی کام میں خرچ کرتا ہے اور کر سکتا ہے جس سے اس کو خود اپنے مفاد کے لئے ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر سرے سے یہ دلچسپی ہی باقی نہ رہے اور اس

کو معلوم ہو کہ اس کے لیئے فوائد و منافع کی جو حد مقرر کر دی گئی ہے اس
سے بڑھ کر وہ اپنی جد و جہد سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے گا تو اس کے قویٰ
فکر و عمل ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔"

(سُود۔ مصنفہ :۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحات ۱۲ اور ۱۳)

غرضیکہ انسان مولانا مودودی کے خیال میں فطری طور پر خود غرض ہے اور وہ اپنے
دل و دماغ اور قوت و بازو کی طاقتوں کو صرف اسی کام پر خرچ کرتا ہے جس سے اس کو
ذاتی فائدہ ہو۔ چنانچہ شخصی ملکیت اور دولت کمانے کی آزادی کو انسان کے فطری حقوق
میں شمار کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں :۔

"اشتراکیت اور سرمایہ داری ایک دوسرے کے خلاف دو
انتہائی نقطوں پر ہیں۔ سرمایہ داری افراد کو ان کے فطری حقوق ضرور دیتی
ہے مگر اس کے اصول و نظریات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو افراد کو جماعت
کے مشترک مفاد کی خدمت کے لئے آمادہ کرنے والی اور تا بحد ضرورت
اس پر مجبور کرنے والی ہو۔ بلکہ درحقیقت وہ افراد میں ایک ایسی خود غرضانہ
ذہنیت پیدا کرتی ہے، جس سے ہر شخص اپنے شخصی مفاد کے لئے جماعت
کے خلاف عملاً جنگ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ تقسیم ثروت کا توازن بالکل بگڑ
جاتا ہے۔ ایک طرف چند خوش نصیب افراد پوری جماعت کے وسائلِ
ثروت کو سمیٹ کر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں اور اپنے سرمایہ کی
قوت سے مزید دولت کھینچے چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف جمہور کی معاشی
حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی جاتی ہے اور دولت کی تقسیم میں

ان کا حصّہ گھٹتے گھٹتے بمنزلہ صفر رہ جاتا ہے۔ اشتراکیت اس خرابی کا
علاج کرنا چاہتی ہے مگر وہ ایک صحیح مقصد کے لئے غلط راستہ اختیار کرتی
ہے۔ اس کا مقصد تقسیمِ ثروت میں توازن قائم کرنا ہے اور یہ بلاشبہ
صحیح مقصد ہے مگر اس کے لئے وہ ذریعہ ایسا اختیار کرتی ہے جو در حقیقت
انسانی فطرت سے جنگ ہے۔ افراد کو شخصی ملکیت سے محروم کر کے بالکل
جماعت کا خادم بنا دینا نہ صرف معیشت کے لئے تباہ کن ہے بلکہ زیادہ
وسیع پیمانے پر انسان کی پوری تمدنی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ کیونکہ یہ
چیز معاشی کاروبار اور نظامِ تمدن سے اس کی رُوحِ رواں اس کی اصلی
قوت محرکہ کو نکال دیتی ہے۔ اسلام ان دو متضاد معاشی نظاموں کے
درمیان ایک معتدل نظام قائم کرتا ہے جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ
فرد کو اس کے پورے پورے شخصی اور فطری حقوق بھی دیئے جائیں اور
اس کے ساتھ تقسیمِ ثروت کا توازن بھی نہ بگڑنے دیا جائے۔ ایک طرف تو
وہ فرد کو شخصی ملکیت کا حق اور اپنے مال میں تصرف کرنے کے اختیارات
دیتا ہے اور دوسری طرف وہ ان سب حقوق و اختیارات پر باطن کی راہ
سے کچھ ایسی اخلاقی پابندیاں اور ظاہر کی راہ سے کچھ ایسی قانونی پابندیاں
عائد کر دیتا ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ کسی جگہ وسائلِ ثروت کا غیر معمولی
اجتماع نہ ہو سکے۔ ثروت اور اس کے وسائل ہمیشہ گردش کرتے رہتے
ہیں، اور گردش ایسی ہو کہ جماعت کے ہر فرد کو اس کا مناسب حصہ
مل سکے۔ اس قسم کا طرزِ معیشت اگرچہ کسی کو کروڑپتی بننے سے نہیں

روک سکتا مگر اس کے ماتحت یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کروڑ پتی کی دولت اس کے ہزاروں ابنائے نوع کی فاقہ کشی کا نتیجہ ہو۔ دوسری طرف یہ طرزِ معیشت تمام افراد کو خدا کی پیدا کی ہوئی دولت میں سے حصہ ضرور دلانا چاہتا ہے مگر ایسی مصنوعی بندشیں لگانا جائز نہیں رکھتا جس کی وجہ سے کوئی شخص اپنی قوت و قابلیت کے مطابق اکتسابِ مال نہ کر سکتا ہو۔"

("سود" مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحات ۱۱ تا ۱۵)

ذاتی مفاد اور مشترکہ مفاد

ذاتی مفاد نے بیشک انسانوں کی اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی ترقی میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا ہے۔ مگر مولانا مودودی کے ان خیالات و تصورات کا منبع قرآن و احادیث نہیں بلکہ یورپ کے سرمایہ پرست فلسفیوں کا "نظریۂ انفرادیت" ہے۔ ان فلسفیوں نے جدید سرمایہ داری کے عہد میں خاندانی رشتوں سمیت تمام رشتوں، ذاتی جوہر، مذہب، اخلاق اور سیاست میں نفع کے لئے لین دین کی کھوٹ تادیکھی اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان فطری طور پر خود غرض ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے دوسرے تمام مظاہر کی طرح انسانی فطرت بھی ساکن اور جامد نہیں۔ وہ ماحول کے زیر اثر ہے اور اس کے بدلنے کے ساتھ ہی ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

قدیم قبائلی دور میں جبکہ پیداوار کے وسیلے اوّل پتھر کے اوزار اور بعد میں تیر کمان تھے اگر انسان قدرت کی طاقتوں اور جنگلی جانوروں کا مشترک طور پر مقابلہ نہ کرتے تو ان کے لئے زندہ رہنا ناممکن تھا۔ جنگل سے پھل جمع کرنے، رہنے کے گھاس پھونس اور پیوں

کا گھر بنانے، نیز جنگلی جانوروں اور ہمسایہ اجنبی قبیلوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے قبیلے کے ممبروں کا مل جل کر رہنا اور کام کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ چنانچہ ساتھ مل کر کام کرنے سے پیداوار کے اوزار اور ان اوزاروں کی مدد سے مشترک محنت کا پھل دونوں مشترکہ ملکیت تھے۔ قدیم قبائلی معاشرہ کی بنیاد وسائلِ پیداوار کی مشترکہ ملکیت پر تھی اور انسانوں کے باہمی تعلقات، اخلاق، عقائد اور رسم و رواج اس بنیاد کو مضبوط و مستحکم کرتے تھے۔ انفرادی ملکیت اور طبقہ واری تقسیم کا نام و نشان بلکہ تصوّر تک نہ تھا۔ ہر فرد کا ذاتی مفاد قبیلے کے مجموعی مفاد سے وابستہ اور اس میں مدغم تھا۔ عربوں کے مشہور شاعر امراء القیس کا یہ شعر جس کے معنی "قبیلے کے مفاد پر اپنا ذاتی مفاد قربان کردو، حتیٰ کہ اپنی محبوبہ کو بھی چھوڑ دو" ثابت کرتا ہے کہ مشترکہ مفاد، مشترکہ ملکیت، مشترکہ دشمن اور ریگستان کی سخت و دشوار زندگی کے باعث عہدِ رسالت سے پہلے صحرائے عرب کے قدیم بدّو قبیلوں میں بھی قبیلے سے باہر یا اس کے خلاف ہیں فرد کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

آگ اور دھاتوں کی دریافت سے پتھر کے اوزاروں کی جگہ دھات کے اوزاروں نے لے لی۔ پہلے انسان شکار کھیل کر بسر اوقات کرتے تھے اب انہوں نے مویشی پالنا، کھیتی باڑی کرنا اور دستکاری کی چیزیں بنانا شروع کیا۔ اس سے قدیم اشتراکی سماج تقسیمِ کار کی بنیادوں پر بٹ گیا اور ایک کی پیدا کی ہوئی یا تیار کی ہوئی چیزوں کا دوسرے کی پیدا یا تیار کی ہوئی چیزوں سے تبادلہ ہونے لگا۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ چیزیں پیدا کرنے یا تیار کرنے کے لئے محنت و مشقت کرنے والے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی، اور اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے قبیلے آپس میں جنگ کر کے ایک دوسرے کو

غلام بننے لگے۔ پیداوار کے دوسرے اوزاروں کی طرح غلام بھی پیداوار کے اوزار اور آقاؤں کی ذاتی ملکیت بن گئے۔

غرضیکہ پیداوار کے اوزار بدلنے سے پیداوار کے طریقے بدل گئے۔ ذاتی ملکیت کی نشو و نما سے لوگوں کے تعلقات بدل گئے۔ آقا اور غلام پیدا ہونے سے قدیم اشتراکی سماج مخالف طبقوں میں بٹ کر درہم برہم ہو گئی۔ اس کی جگہ ایک نئی سماج نے لی۔ یہ غلام داری سماج تھی۔ پہلے افراد کے ذاتی مفاد قبیلے کے مفاد میں مدغم تھے اور مروجہ رسم و رواج، اخلاقی قدریں اور مذہبی عقائد قبیلے کے مجموعی مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر دینے کی تلقین کرتے تھے۔ اب افراد اپنے ذاتی فائدے بالخصوص وسائل پیداوار کے مالک مٹھی بھر امیر اپنی منفعت کے لئے اکثریت کے مجموعی مفاد کو قربان کرنے لگے۔ جب عملی طور پر یہ کیفیت ایک حقیقت بن کر سامنے آگئی تو اخلاقی تصورات عقائد، رسم و رواج اور قانون بھی بدل گئے اور انفرادیت پسندی کی حمایت کرنے لگے۔

انفرادیت پسندی غلام داری اور جاگیرداری کے عہد میں بھی تھی مگر اپنے انتہائی عروج تک وہ موجودہ سرمایہ داری دور میں پہنچی ہے۔ موجودہ دور میں فروخت کر کے نفع کمانے کے لئے اشیا کی پیداوار نے اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر تمام پرانے جاگیری پدر سر قبیلی اور دیہاتی رومانوی تعلقات کو ختم کر کے خاندانی رشتوں سمیت تمام رشتوں کو خالص زر پروری اور محض لین دین کے رشتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ خود غرضی جو آج ہم میں پائی جاتی ہے اور وہ نفسا نفسی جو آج ہم میں موجود ہے اور ہر روز بڑھ رہی ہے، سرمایہ داری کے نظام پیداوار اور خرید و فروخت کے مخصوص ماحول کا منطقی نتیجہ ہے۔ اشتراکی سماج میں چونکہ وسائلِ پیداوار سب

کی ملکیت ہوں گے، اور اشیاء کی پیداوار اور خرید و فروخت نفع کمانے کے لئے نہیں ہوگی، اس لئے افراد کے ذاتی مفاد اور سب کے مشترکہ مفاد میں کوئی تضاد اور ٹکراؤ نہ ہوگا۔ دونوں مفاد ایک دوسرے میں مدغم ہوں گے۔ سوویٹ یونین کا ہر شہری اپنی ترقی اور بہتری کے لئے ساری سوویٹ سماج کی اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی ترقی کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔

شخصی ملکیت اور سرمایہ داری

مگر مولانا مودودی ساری دنیا کے سرمایہ پرست فلاسفروں، مفکروں، سیاستدانوں اور رہنماؤں کی طرح وسائلِ پیداوار کی شخصی ملکیت اور دولت کمانے کے حقوق کو انسان کے فطری حقوق قرار دیتے ہیں اور ان حقوق سے محروم کرنے کو "انسانی فطرت کے خلاف جنگ" کے مترادف سمجھتے ہیں۔ وہ مالکانہ حقوق کا "احترام" کرتے ہیں اور کسی حکومت یا کسی مجلسِ قانون ساز کو اجتماعی بہتری کے لئے بھی ان مالکانہ حقوق کو چھیننے یا ان میں کمی کرنے کو شرعاً "ناجائز" اور "ظلم" قرار دیتے ہیں۔ ("اسلام کا نظامِ حیات" مصنفہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔ دیکھئے باب "اسلام کا اقتصادی نظام")

ہر سرمایہ دار اور سرمایہ داری نظام کا حامی مالکانہ حقوق کو "ابدی" اور "فطری" حقوق قرار دیتا ہے۔ مگر یہ حقوق "ابدی" اور "فطری" اس لئے نہیں کہ ہماری تہذیب کے ابتدائی ادوار میں وسائلِ پیداوار شخصی ملکیت نہیں بلکہ مشترکہ ملکیت تھے۔ عہدِ رسالت سے پہلے عربوں میں بھی چشمے، چراگاہیں، کھجور کے درخت حتّٰی کہ بعض قبیلوں میں مویشی بھی عرب قبیلوں کی مشترکہ ملکیت تھے۔ شخصی ملکیت کا تعلق "انسانی فطرت" سے نہیں ہے۔

اس کا تعلق وسائل پیداوار کے اوزاروں اور وسیلوں میں ایک مخصوص ترقی اور تبدیلی سے ہے۔

موجودہ سرمایہ داری نظام کی بنیادیں وسائل پیداوار (زمین، کارخانے، اوزار، مکانات، کانیں اور باغات وغیرہ) کی شخصی ملکیت اور زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے اشیاء کی پیداوار پر ہے۔ چنانچہ اس عہد میں سرمایہ داروں نے نفع کما کر زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرنے کے لئے سائنس کے نئے نئے انکشاف کی بنا پر نئی دیو ہیکل مشینیں ایجاد کر کے پیداوار کے وسیلے اور طریقے بدل دیئے ہیں اور معیشت کی سب بنیادیں تبدیل کر دی ہیں۔ پہلے ایک شخص ایک چیز تیار کرتا تھا۔ اب ایک چیز تیار کرنے میں ساری دنیا کے مزدور حصہ لیتے ہیں۔ پہلے کسان اپنے کھیتوں، دست کار اپنے اوزاروں اور چھوٹی چھوٹی ورکشاپوں، اور تاجر اپنی چھوٹی چھوٹی دکانوں کا مالک تھا۔ اب یہ سب کے سب یعنی ۹۸ فیصدی افراد اپنے وسائل پیداوار کی ملکیت سے محروم ہو کر اپنی طاقتِ محنت فروخت کر کے روزی کمانے والے مزدوروں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں جو دو فیصد افراد وسائل پیداوار کے اس وقت مالک ہیں، وہ بھی انفرادی طور پر نہیں، مشترکہ طور پر اُن کے مالک ہیں۔ ساری اقتصادیات چند بڑے بڑے صنعتی اداروں (ٹرسٹوں، کارپوریشنوں وغیرہ) اور بنکوں کے قبضہ میں ہے۔ اور یہ بڑے بڑے صنعتی ادارے اور بنک چند دولت مند خاندانوں کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ چنانچہ خود سرمایہ داری نے جس کی بنیادیں وسائل پیداوار کی شخصی ملکیت پر ہیں، ترقی کے وسائل پیداوار کی انفرادی ملکیت اور اشیا تیار کرنے کے لئے اُن کے انفرادی طور پر استعمال دونوں کو ختم کر دیا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ بڑے بڑے سرمایہ دار ملکوں میں عملی طور پر حالت یہی ہے۔ ان ملکوں میں تمام وسائل پیداوار چند امیر خاندانوں

کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان ایسے پسماندہ زرعی ملکوں میں اگرچہ حالات اس نوبت کو نہیں پہنچے۔ مگر یہ پسماندہ ممالک بھی اس منزل کی طرف جا رہے ہیں۔

اشتراکیت اور حقوقِ ملکیت

غرضیکہ جدید سرمایہ داری نظام خود ہی وسائلِ پیداوار کی شخصی ملکیت کو ختم کر کے دو فیصد افراد کی مشترکہ ملکیت بنا رہا ہے۔ کمیونسٹوں کا "جرم" صرف یہ ہے کہ وہ وسائلِ پیداوار کو دو فیصد افراد کی مشترکہ ملکیت کے بجائے۔ سب کی مشترکہ ملکیت بنانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ حقوقِ ملکیت کو چھیننا نہیں چاہتے بلکہ ان سب کو بھی مالک بنانا چاہتے ہیں جنہیں سرمایہ داروں نے اپنے سرمایہ کی قوت سے ملکیت کے حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ وہ وسائلِ پیداوار کو سب کی مشترکہ ملکیت اس لئے بنانا چاہتے ہیں کہ محنت کش عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی نفع کی شکل میں ان چند امیروں کی جیبوں میں نہ جائے جو کوئی کام نہیں کرتے اور زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے عوام کے معیارِ زندگی کو نیچے سے نیچے گرا رہے ہیں۔ وسائلِ پیداوار پر چند افراد کے قبضہ نے پیداواری طاقتوں کو قید کر رکھا ہے اور جب تک وہ آزاد نہ ہوں عوام کا معیارِ زندگی بلند نہیں ہو سکتا۔ سب کو روٹی، روزگار اور آرام میسر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح انسانی ترقی اور بہبودی کے لئے قدیم زمانے میں قبیلوں کی مشترکہ ملکیت کا خاتمہ ضروری تھا۔ اُسی طرح آج حالات وسائلِ پیداوار کی مشترکہ ملکیت کا تقاضا کرتے ہیں۔

مگر جماعت اسلامی انسانیت کی ترقی اور فلاح کے لئے موجودہ دَور کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ وہ دو فیصد آبادی کے وسائلِ پیداوار کی ملکیت چھیننے کو شرعاً ناجائز

اور "ظلم" قرار دیتی ہے۔

مولانا مودودی "معاشی زندگی میں ہر فرد کے شخصی مفاد کا تمام افراد کے اجتماعی مفاد سے گہرا رابطہ[1] چاہتے ہیں، مگر "کسی ایسی سیاسی یا معاشی تنظیم کو پسند نہیں کرتے جو فرد کو جماعت میں گم کردے اور اس کے لئے وہ آزادی باقی نہ چھوڑے جو اس کی شخصیت کی صحیح نشو و نما کے لئے ضروری ہے"۔ غرضیکہ وہ کسی ایسی سیاسی یا معاشی تنظیم کو پسند نہیں کرتے جو زرداروں کے لئے دوسروں کی محنت غصب کر کے دولت کمانے کی آزادی باقی نہ چھوڑے۔ وہ سماج میں کروڑپتیوں اور ناداروں کی موجودگی بھی چاہتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی چاہتے ہیں کہ دونوں کے مفاد میں اتحاد اور یک جہتی ہو۔ یہ خواہش صرف مولانا مودودی کی نہیں ہر سرمایہ دار کی ہے۔

مساوات اور جماعت اسلامی

جماعت اسلامی کے علما باتیں وہی کہتے ہیں جو جدید علوم سے ناواقف دقیانوسی مولوی زرداروں کی حمایت میں کہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی طرز تحریر جدید ہے اور وہ جدید سائنٹیفک اصطلاحات کو بڑی مہارت سے غلط مصرف کے لئے مسخ کر کے استعمال کرتے ہیں۔ پرانی قسم کے مولوی امیری اور غریبی کو خدا کی طرف منسوب کر کے "خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد" کی دلیل پیش کرتے ہیں اور مولانا مودودی اسلام کے اقتصادی نظام کی وضاحت فرماتے ہوئے "رزق میں مساوات" کو "غیر فطری" اور "زبردستی" کی "مصنوعی مساوات" قرار دے کر اس کی مذمت کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں

---

[1] "سود" صفحہ ۱۴ [2] "اسلام کا نظام حیات"۔ صفحہ ۲۸

کے درمیان رزق میں تفاوت ہو لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطۂ نظر سے مقصد اور اصول دونوں میں غلط ہیں، جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائیں۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے، وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصولِ رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ فطرت سے قریب تر نظام وہی ہو سکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ ("اسلام کا نظام حیات" صفحہ ۴۶)

غرضیکہ مولانا مودودی کے نزدیک اسلامی مساوات ہزارہا ایکڑ زمین کے مالک ایک جاگیردار کو جو ایک پیسہ خرچ کئے بغیر گھر بیٹھے اپنی زمین کی کل پیداوار کے دو تہائی حصہ سے زیادہ کا مالک بن جاتا ہے اور اس کے مزارعہ کو جو دس بارہ ایکڑ زمین کاشت کے لئے لے کر اپنی گرہ سے خرید کر بیج ڈالتا ہے اور اپنے مویشیوں کی مدد سے خون پسینہ ایک کر کے زمین کی کاشت کرتا ہے، مگر پیداوار کے ایک تہائی حصہ سے زیادہ کا مالک نہیں بن سکتا، دونوں کو معیشت کے میدان میں اپنے اپنے مقام سے دوڑ کی ابتدا کرنے اور دولت کمانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا پورا موقعہ دیتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"جو موٹر لئے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے۔ جو صرف دو پاؤں لایا ہے وہ پیدل ہی چلے اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلنا شروع کر دے۔"

(اسلام کا نظام حیات، صفحہ ۴)

مولانا مودودی کے نزدیک یہ ہے حصولِ رزق کی جدوجہد کے مواقع کی اسلامی مساوات! معیشت کے میدان میں "کھلی اور بے لاگ" دوڑ جسے مولانا مودودی نے "حصولِ رزق کی جدوجہد

کے مواقع ہیں مساوات" کا نام دیا ہے، نظام سرمایہ داری میں اب بھی موجود ہے۔ نظری اعتبار سے جاگیردار اور مزارعہ، سرمایہ دار اور مزدور غرضیکہ ہر فرد و بشر کو معیشت کے میدان میں دوڑ لگانے کا حق حاصل ہے۔ مگر عملی طور پر اس "دوڑ" میں امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہو رہے ہیں۔ محنت و مشقت کرنے کے باوجود آج کے نچلے طبقوں یعنی نچلے درمیانہ طبقوں، دستکاروں، مالک کاشتکاروں اور چھوٹے تاجروں کے قبضہ سے مکان زمینیں چھوٹے چھوٹے کارخانے اور دیگر وسائل پیداوار نکل کر چند دولتمندوں کے قبضہ میں جا رہے ہیں۔

جس قسم کی "مساوات" کو مولانا مودودی "اسلامی مساوات" کہتے ہیں وہ اب بھی موجود ہے مگر اس "مساوات" نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۹ء تک متحدہ برطانوی پنجاب میں بیس[1] ہزار کے قریب مالک کاشتکاروں کو اپنی زمینیں فروخت کر کے مزارعوں اور کھیت مزدوروں کی صف میں شامل ہونے پر مجبور کیا، حالانکہ اس عرصہ میں اس صوبہ کی زیر کاشت زمین میں تقریباً بیس[2] لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہوا تھا۔ صرف یہی نہیں یہ "مساوات" پچاس ایکڑ تک زمین کے مالکوں کے قبضہ سے ۲۳[3] لاکھ ایکڑ زمین بھی نکالنے کا باعث بنی، حالانکہ ان کی تعداد میں بارہ[4] ہزار کا اضافہ بھی ہوا۔ برعکس اس کے اس "مساوات" نے اس عرصہ میں پچاس ایکڑ سے زیادہ زمین کے مالکوں کی تعداد بتیس ہزار[5] کے قریب

---

[1] ۔ متحدہ برطانوی پنجاب میں مالکانِ اراضی کی تعداد ۱۹۲۴ء میں ۳۵ لاکھ اور ۱۹۳۹ء میں ۳۴ لاکھ ۸۰ ہزار تھی۔

[2] ۱۹۲۴ء میں برطانوی پنجاب کا زیر کاشت رقبہ دو کروڑ ۹۵ لاکھ ایکڑ اور ۱۹۳۹ء میں تین کروڑ دس لاکھ ایکڑ تھا۔

[3] پچاس ایکڑ سے کم زمین کے مالکوں کے قبضہ میں دو کروڑ ۱۵ لاکھ ایکڑ زمین ۱۹۲۴ء میں تھی اور ایک کروڑ ۹۲ لاکھ ایکڑ ۱۹۳۹ء میں۔

[4] ۵۰ ایکڑ سے کم زمین کے مالکوں کی تعداد ۱۹۲۴ء میں تقریباً ۳۲ لاکھ ۸۴ ہزار اور ۱۹۳۹ء میں ۳۳ لاکھ ۹۶ ہزار ایکڑ تھی۔

[5] ۵۰ ایکڑ سے زیادہ زمین کے مالک ۱۹۲۴ء میں تقریباً ایک لاکھ ۱۵ ہزار اور ۱۹۳۹ء میں ۸۲ ہزار تھی۔

کم کردی۔ مگر جو پچاس ایکڑ سے زیادہ زمین کے مالک رہے، ان کے قبضہ میں ۳۴[۱] لاکھ ایکڑ زمین کا اضافہ کردیا۔

مساوات اور کمیونسٹ

یہ "مساوات" ایک طرف دولت اور پیداوار کے تمام وسیلوں کو چند ہاتھوں میں مرکوز کررہی ہے اور دوسری طرف مفلسی، ناداری اور بے روزگاری کو عوام میں پھیلا رہی ہے۔ کمیونسٹوں کا مساوات کے متعلق نظریہ مختلف ہے۔ سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی سترویں کانگریس کی رپورٹ میں سٹالین نے ان کے نظریہ کی اچھی طرح وضاحت کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں :

"مساوات سے مارکسزم کی مراد انفرادی ضرورتوں اور انفرادی زندگی میں یکسانیت اور مساوات نہیں ہے بلکہ طبقات کو ختم کرنا ہے۔

(۱) سرمایہ داروں کا تختہ الٹنے اور ان کی املاک کو ضبط کرنے کے بعد تمام محنت کشوں کو مساوی طور پر لوٹ کھسوٹ سے نجات دلانا۔

(۲) پیداوار کے ذرائع (زمین، فیکٹری اور کارخانے، جنگل، معدنیات اور دریا وغیرہ۔ مترجم) کو پوری سوسائٹی کی ملکیت میں بدلنا (اب تک ذرائع پیداوار سرمایہ دار ملکوں میں ذاتی ملکیت ہیں۔ مترجم) اور پھر ذرائع پیداوار کی حد تک ذاتی ملکیت کو سب کے لئے مساوی طور پر منسوخ کرنا۔

(۳) اپنی قابلیت کے مطابق کام کرنا سب کا مساوی فرض ہوگا اور تمام

۱؎ پچاس ایکڑ سے زیادہ زمین کے مالکوں کے پاس ۱۹۲۴ء میں تقریباً ۷۰ لاکھ ایکڑ اور ۱۹۳۹ء میں ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ایکڑ تھی۔

محنت کشوں کو ان کے کام کی مقدار کے مطابق معاوضہ پانے کا مساوی حق حاصل ہوگا۔ (یہ سوشلسٹ سوسائٹی میں ممکن ہوگا)

(۴) اپنی قابلیت کے مطابق کام کرنے کا مساوی فرض اور تمام محنت کشوں کو اپنی ضرورتوں کے مطابق معاوضہ پانے کا مساوی حق (یہ کمیونسٹ سوسائٹی میں ممکن ہوگا) مزید یہ کہ مارکسزم اس مفروضے کو مان کر آگے بڑھتا ہے کہ لوگوں کے مذاق اور ان کی ضرورتیں (نہ صفات اور نہ مقداریں) یکساں اور مساوی نہیں ہوتیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔ نہ سوشلزم کے دور میں اور نہ کمیونزم کے دور میں" یہ ہے مساوات کا مارکسی تصور۔ مارکسزم نے کسی دوسری قسم کی مساوات کو کبھی تسلیم نہیں کیا ہے اور نہ آج تسلیم کرتا ہے۔

"اس سے (یعنی مساوات کے مارکسی تصور سے۔ مترجم) یہ نتیجہ نکالنا کہ سوشلزم یکسانیت اور برابری چاہتا ہے، سوسائٹی کے تمام افراد کی ضرورتوں کو برابر کر دینا چاہتا ہے۔ ان کے مذاق اور ان کی ذاتی زندگیوں کو یکساں اور ہموار کر دینا چاہتا ہے۔ یعنی مارکسیوں کی تجویز ہے کہ سب لوگ ایک ہی سے کپڑے پہنیں اور ایک جیسا کھانا کھائیں اور وہ بھی مساوی مقداریں۔ ایسی باتیں کہنا اپنی گھٹیا ذہنیت کا ثبوت دینا ہے اور مارکسزم کو بدنام کرنا ہے۔

"وقت آگیا ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ مارکسزم ہمواریت (EQUALISATION) کا دشمن ہے۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے کمیونسٹ مینی فسٹو میں بھی پرانے خیالی سوشلزم پر کڑی تنقید کی اور اسے رجعت پسند کہا کیونکہ خیالی سوشلزم "عالمگیر قلندری اور انتہائی بھونڈی قسم کی سماجی ہمواریت" کا پرچار کرتا تھا۔ اینگلز نے اپنی کتاب

قاطع ڈوہرنگ میں ایک پورا باب انقلابی ہمواریت پسند سوشلزم کی رو پر صرف کیا۔ ڈوہرنگ نے مارکسی سوشلزم کے جواب میں ہمواریت پسند سوشلزم کی تلقین کی تھی۔ اینگلز نے لکھا ہے کہ مساوات کے پرولتاری مطالبے کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ طبقات کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ مساوات کا کوئی دوسرا مطالبہ جو اس مطالبے کے آگے جائے لغو ہے۔

"لینن نے بھی یہی بات کہی ہے۔ اینگلز نے یہ بالکل سچ کہا کہ مساوات کا کوئی تصور جو طبقات کو ختم کرنے سے تجاوز کرے ایک احمقانہ اور لغو تعصب ہے۔ اس ضمن میں سرمایہ دار عالموں نے ہم پر یہ الزام لگانے کی کوشش کی ہے کہ ہم سب لوگوں کو ایک دوسرے کے برابر کرنا چاہتے ہیں۔ سرمایہ دار عالموں نے خود ہی مساوات کا یہ مہمل تصور باندھا اور اب وہ اس کا الزام ہم پر تھوپتے ہیں۔ لیکن اپنی جہالت کے باعث وہ یہ نہ جان سکے کہ سوشلسٹوں نے جدید علمی سوشلزم کے بانیوں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے کہا ہے کہ اگر مساوات کے معنی طبقوں کے خاتمے کے نہ ہوں تو مساوات ایک کھوکھلا لفظ ہے۔ ہم طبقات کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم مساوات کے علمبردار ہیں لیکن یہ دعویٰ کہ ہم سب لوگوں کو ایک دوسرے کے برابر کرنا چاہتے ہیں ایک کھوکھلا دعویٰ ہے۔ سرمایہ دار دانشوروں کے ذہن کی ایک احمقانہ ایجاد ہے۔"

(لینن کی تقریر "آزادی اور مساوات کے نعروں کے ذریعہ لوگوں کو دھوکا دینا" کا اقتباس) (لینن ازم کے مسائل: از سٹالین صفحہ ۳۰۲ مطبوعہ ماسکو، ۱۹۴۷ء)

مولانا مودودی زرداروں کی معاشرت و معیشت میں "بے لگامی" اور دولت

کے چند ہاتھوں میں سمٹاؤ کی مذمت کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے اس بات پر بھی بار بار زور دیتے ہیں کہ "اسلامی طرزِ معیشت کسی کو کروڑپتی بننے سے نہیں روکتا" آپ فرماتے ہیں کہ "اسلامی طرزِ معیشت کچھ ایسی اخلاقی اور قانونی پابندیاں عائد کرتا ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ کسی جگہ وسائلِ ثروت کا غیر معمولی اجتماع نہ ہو سکے، ثروت اور اس کے وسائل ہمیشہ گردش کرتے ہیں، اور گردش ایسی ہو کہ جماعت کے ہر فرد کو اس کا تناسب حصہ مل سکے" یہ اخلاقی، مذہبی اور قانونی پابندیاں سُود کی ممانعت، زکوٰۃ، خیرات، حج اور جائداد کی ورثا میں تقسیم ہیں۔

سرمایہ داری اور جماعت اسلامی

گذشتہ چودہ سال سے یہ اخلاقی، مذہبی اور قانونی پابندیاں مسلمانوں پر عائد ہیں، مگر مسلمان زرداروں کی معاشرت و معیشت میں "بے لگامی" اور وسائلِ پیداوار کو چند ہاتھوں میں مرکوز ہونے سے نہیں روک سکیں۔ مولانا مودودی خود تسلیم کرتے ہیں کہ "ایک طرف چند خوش نصیب افراد پوری جماعت کے وسائلِ ثروت کو سمیٹ کر لکھ پتی اور کروڑپتی بن رہے ہیں، اور اپنے سرمائے کی قوت سے مزید دولت کھینچتے جاتے ہیں اور دوسری طرف جمہور کی معاشی حالت خراب سے خراب تر ہو رہی ہے اور دولت کی تقسیم میں ان کا حصہ گھٹتے گھٹتے بمنزلہ صفر رہ گیا ہے" اس کا سبب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تاریخی ادوار کے تقاضے پورے ہو کر رہتے ہیں۔ اوّل جاگیرداری اور پھر سرمایہ داری کے دور میں معاشی اور معاشرتی ترقی کے لئے کروڑپتیوں کا وجود اور دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹاؤ بہت ضروری تھا، چنانچہ زرداروں کی معاشرت و

معیشت ہیں "بے لگامی" اور وسائلِ پیداوار کے چند ہاتھوں میں سمٹاؤ کے خلاف پہلے زمانے کی اخلاقی، مذہبی اور قانونی پابندیاں کارگر نہ ہوئیں۔

مگر اب حالات بدل گئے ہیں، ہماری معاشرت و معیشت کی بنیادیں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جس طرح ایک زمانے میں غلامانہ نظامِ زندگی سماج کو ترقی کی چند منزلوں میں رہنمائی کرنے کے بعد اس کی آگے ترقی کے راستہ میں پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا تھا اور جس طرح ایک زمانے میں جاگیرداری ترقی کی طرف چند قدم لے جانے کے بعد سماج کو مزید ترقی کی طرف لے جانے کی صلاحیتیں کھو چکی تھی، اسی طرح آج سرمایہ داری نظام اور وسائلِ ثروت کا چند ہاتھوں میں سمٹاؤ ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ چند "ظاہری" اور "باطنی" اخلاقی یا مذہبی پابندیاں اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتیں۔ آج لاکھوں اور کروڑوں روپیہ نفع کے سودے منٹوں میں ہوتے ہیں۔ آج دس پندرہ ہزار مزدوروں پر حکومت کرنے اور ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہڑپ کرنے والا کارخانہ دار کروڑوں روپے سالانہ نفع کماتا ہے۔ چنانچہ کروڑوں روپے سالانہ نفع کمانے والے اصفہانیوں، ہارونوں، جیبیوں اور مراتب علیوں نیز زمینوں کی پیداوار میں کوئی روپیہ نہ لگانے اور کوئی محنت نہ کرنے کے باوجود اپنے مزارعوں سے مالکانہ یا لگان کے علاوہ جو کل پیداوار کا عموماً نصف ہوتا ہے کئی قسم کے جاگیرشاہی ٹیکس، مثلاً خرچہ، راج دربار، کرایہ، نذرانہ، کمیانہ، منشیانہ، شادی ٹیکس، مویشی ٹیکس، دروازہ ٹیکس، الیکشن ٹیکس، حج ٹیکس، موٹر ٹیکس، بیمہ ٹیکس وغیرہ وصول کرنے اور اس طرح کل پیداوار کے تین چوتھائی حصہ کے مالک بن جانے والے دولتانوں، خاکوانیوں، کھوڑوں، نونوں، ٹوانوں، تالپوریوں، کالاباغوں، گردیزیوں، لغاریوں وغیرہ کا حج کے لئے جانے اور جائداد کی ورثہ میں تقسیم کرنے سے کچھ نہیں بگڑتا۔ نہ دولت ان کے

ہاتھوں میں سمٹنے سے رُکتی ہے' نہ وسائلِ پیداوار ان کے قبضہ میں جانے سے رُکتے ہیں' نہ مالک کاشت کار اپنی زمینوں' دست کار اپنے اوزاروں اور چھوٹی چھوٹی دکانوں والے غریب اور درمیانہ تاجر اپنی تجارتی دکانوں سے محروم ہو کر اپنی طاقتِ محنت فروخت کر کے پیٹ پالنے والے مزدوروں کی صف میں شامل ہونے سے بچتے ہیں' نہ زکوٰۃ اور خیرات لینے سے عوام کی حالت سُدھرتی ہے اور نہ موجودہ دُنیا جو دوزخ کا نمونہ ہے جنت میں تبدیل ہوتی ہے۔

درحقیقت سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان تیسری کوئی "متوسط راہ" نہیں ہے۔ مولانا مودودی اسلام کے اقتصادی نظام کے نام سے جو راہ پیش کرتے ہیں، وہ کوئی تیسری راہ نہیں۔ وہی راہ ہے، جس پر سرمایہ دار اور جاگیردار گامزن ہیں۔ مولانا مودودی دراصل بڑے سرمایہ داروں' جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کسانوں اور مزارعوں کو زمین کا مالک بنانا نہیں چاہتے۔ وہ نہیں چاہتے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی املاک قومی ملکیت بنائی جائیں اور مزدوروں کی حالت بنیادی طور سے بہتر ہو لیکن چونکہ آج مزدور اور کسان بیدار ہو چکے ہیں اور اپنے جائز حقوق کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں، اس لئے مولانا کو صاف طور سے یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی وہ اپنی عوام دشمنی پر "اسلامی نظام" کا پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ لیکن پاکستان کے عوام یہ سمجھ لیں گے کہ یہ پردہ خدا اور رسولؐ کا ڈالا ہوا نہیں' اسے اسلام کی تاریخ سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔ یہ دراصل بڑے سرمایہ داروں اور بڑے زمینداروں اور ان کے حمایتی مولانا مودودی کے ہاتھوں کا ہی بُنا ہوا ایک جال ہے جس میں کوئی سمجھدار اور ایماندار آدمی نہیں پھنسے گا۔

سیاسی تصوّرات

عربوں کا قبائلی نظام

اور

خلافتِ راشدہ

جماعت اسلامی صرف خلافتِ راشدہ تک کے دور کو اسلامی حکومت کا دور سمجھتی ہے اور اس کے بعد تمام مسلمان شاہی خاندانوں کی حکومتوں کو غیر اسلامی حکومتیں قرار دیتی ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت، سوویٹ جمہوریت اور عوامی جمہوریت تینوں کو مسترد کرتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ اس کی جدوجہد کا مقصد وہی نظام قائم کرنا ہے جو رسالت اور خلافتِ راشدہ کے عہد میں مدینہ میں تھا۔

اگر تاریخ کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت چھپی نہیں رہتی کہ خلافتِ راشدہ کے دور کا نظام عربوں کے سماجی ارتقا کے ایک مخصوص دور کا پرتو تھا۔ وہ قبائلی نظام اور جاگیرداری نظام کے درمیان ایک عبوری دور کا نظام تھا۔

جزیرۃ العرب میں ساحل کے قریب جہاں بارش کبھی کبھار ہوتی ہے زرعی بستیاں

اور شہر ہیں باقی تمام ملک صحرا ہے۔ اس صحرا میں عرب قبیلے چشموں کے قریب چراگاہوں میں اونی کپڑے کے خیموں میں رہتے اور رات کے وقت چاندنی میں مویشی چراتے یا سفر کرتے تھے۔ کئی ایک قبیلے ابھی تک خانہ بدوش تھے اور اپنے مویشیوں کو لئے ہوئے ادھر سے اُدھر پانی اور چارے کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ ان قبیلوں کا قبیلی نظام تھا۔ عمر کے اعتبار سے قبیلہ میں سب سے بڑا رکن سردار تھا اور شیخ کہلاتا تھا اس کا ہر حکم ماننا قبیلہ کے ہر رکن کا مذہبی اخلاقی، سیاسی اور سماجی فرض تھا مگر اس کی حیثیت مطلق العنان بادشاہ ایسی نہ تھی۔ وہ قبیلہ کی قدیم روایات، رسم و رواج اور قبیلہ کے ہر خاندان کے بزرگ ترین اراکین پر مشتمل مجلس شوریٰ کے فیصلوں کا پابند تھا

یہ قبیلے ایک دوسرے سے چشمے، چراگاہیں اور مویشی چھیننے کے لئے برسرپیکار رہتے تھے۔ مالِ غنیمت میں سے جو عموماً لونڈیوں اور مویشیوں کی شکل میں ہوتا زیادہ حصہ سردارِ قبیلہ لیتا تھا۔ کچھ حصہ قبیلہ کی مشترکہ ضروریات کے لئے الگ رکھ لیا جاتا تھا، اور باقی سب قبیلے کے خاندانوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ عہد رسالت سے پہلے صحرائے عرب کے قبیلوں میں ذاتی ملکیت وجود میں آچکی تھی۔

صحرا میں رہنے والے عرب قبیلوں کی بنیاد خون کے رشتہ پر تھی۔ زرعی بستیوں اور تجارتی شہروں میں یہ بنیادیں ٹوٹ چکی تھیں۔ ان میں ایک قبیلہ نہیں، کئی قبیلے رہتے تھے مثلاً مدینہ میں یمنی عربوں کے دو قبیلوں خزرج اور اوس کے علاوہ عیسائی اور یہودی عرب قبیلے بھی آباد تھے۔ مکہ معظمہ میں اکثریت قریش کی تھی جو خانہ کعبہ کے محافظ اور متولی ہونے کے علاوہ متمول تاجر تھے اور یمن کی بندرگاہوں سے لے کر عراق، شام اور مصر تک تجارتی مال کو اِدھر سے اُدھر لے جاتے تھے۔ مدینہ منورہ برعکس اس کے کاشتکاروں

دستکاروں اور چھوٹے تاجروں کی بستی تھا۔

تجارت کے لئے رجب کے مہینے میں جنگ ممنوع تھی۔ یمن اور مغربی حجاز کے ساحل کے قریب شہروں، نیز بعض نخلستانوں کے متصل آبادیوں میں تجارتی میلہ منڈیاں لگتی تھیں۔ عرب قبیلے ان منڈیوں میں اپنی پیداوار مثلاً مویشی، اون اور پنیر وغیرہ فروخت کرتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے تھے۔ ذیقعد، ذی الحج اور محرم کے مہینوں میں بھی جنگ ممنوع تھی۔ ان مہینوں میں دُور دُور سے عرب حج کرنے کے لئے مکہ پہنچتے تھے۔ چنانچہ مکہ جہاں سال میں دو مرتبہ بہت بڑے اجتماع ہوتے تھے تجارتی لین دین کا بہت بڑا مرکز تھا۔ کعبہ کے پاسبان اور حجاز کے سب سے بڑے تجارتی شہر کے اُمرا ہونے کے سبب سے قریش کا تمام عرب قبیلوں پر اثر و اقتدار تھا۔

صحرائے عرب کے بدّو قبیلے پدرسری قبیلی نظام کے ماتحت تھے مگر زرعی بستیوں اور تجارتی شہروں میں سماجی نظام پدرسری قبیلی دَور سے آگے نکل چکا تھا۔ یہاں قدیم شہری ریاست کے نظام کی ابتدا ہو چکی تھی۔ مکہ معظمہ امویوں (قریش کی ایک شاخ) کی سرکردگی میں قریش اُمرا کی شہری ریاست تھا۔ مدینہ منورہ بھی شہری ریاست تھا مگر یہ شہری ریاست کاشت کاروں، دست کاروں اور چھوٹے تاجروں کی تھی۔

عہد رسالت سے تقریباً تین سو سال پہلے سے قبائلی نظام اور شہری ریاست دونوں پر جمود طاری تھا۔ اس کی وجہ سے باہمی لڑائیاں رہتی تھیں۔ پہلا سبب یہ تھا کہ خوراک اور جائے رہائش کی قلت اور آبادی میں روزمرہ اضافہ سے قبیلوں کی آپس میں جنگ رہتی تھی۔ یہ جنگ تجارت کے لئے نقصان دہ تھی۔ نہ صرف تاجروں کے قافلے لٹ جاتے تھے۔ بلکہ تاجروں کو ہر قبیلے کی حدود میں سے گزرنے کے لئے ٹیکس

ادا کرنا پڑتا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ رومی تجارتی جہازوں کے براہ راست بحر ہند میں آنے جانے سے مشرقی و مغربی ممالک کے درمیان تجارت کی اجارہ داری یمنی عربوں سے چھن گئی۔ اس کا اثر حجاز کے تاجروں اور تجارتی شہروں پر بھی پڑا۔ تیسرا سبب رومی شہنشاہ جسٹینین کے اشارہ پر حبشہ کے عیسائی بادشاہ کا یمن پر حملہ تھا جس نے ۵۲۵ء میں بنو حمیر کو شکست دے کر اس پر مکمل قبضہ کر لیا تھا۔ غرضیکہ اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے ایک جمود طاری تھا۔ بنو حمیر کے آخری تاجدار کے ایک قریبی رشتہ دار سیف بن ذی یزن نے پارس کے ساسانی شہنشاہ نوشیرواں سے فوجی مدد حاصل کر کے ۵۷۵ء میں حبشی فوجوں کو شکست دی اور یمن سے نکال دیا۔ مگر عربوں کا اصل مقصد پورا نہ ہوا۔ کیونکہ ساسانیوں نے خود قبضہ کر لیا اور عربوں نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ نہ انہیں آزادی ملی ہے اور نہ تجارت پر پھر قبضہ ہوا ہے، صرف آقا تبدیل ہوئے ہیں۔

عرب تاجر اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور تجارتی اجارہ داری کو بحال کرنے، اپنی مفلسی اور ناداری کی حالت کو بدلنے کے آرزومند تھے اور صحرائے عرب کے قبیلے عراق، شام اور مصر کے زرخیز خطوں میں پھیل جانے کے لئے بے قرار تھے۔ وقت اور حالات ایسے تصورات، ایسے مذہبی عقائد اور ایسی ہمہ گیر تحریک کا تقاضا کر رہے تھے، جو عربوں کو آپس میں لڑنے سے روک کر دوسرے ملکوں کو فتح کرنے اور دنیا کے زرخیز خطوں میں پھیل جانے کے لئے متحد کرے اور جو مشرقی و مغربی ممالک کے درمیان تجارت کی اجارہ داری پھر عرب تاجروں کے حوالے کر دے۔ اس اتحاد کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اپنے لاؤ لشکر سمیت قبائلی نظام (مثلاً قبائلی عصبیت، قبائلی لڑائیاں اور ہر قبیلے کے اپنے الگ دیوتا) تھا۔

دُنیا کے تمام قدیم صحرائی قبیلوں کی طرح عرب بھی چاند کو جس کی رات کے وقت چاندنی میں وہ مویشی چراتے اور سفر کرتے تھے، دیوتا سمجھ کر اس کی پرستش کرتے تھے۔ سورج کی پرستش زرعی تہذیب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے، جب فصل پکنے کے لئے لوگ سورج کی روشنی اور گرمی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ قریش کے خُدا کا نام اللہ تھا اور لات (چراگاہوں کی دیوی) منات (قسمت کی دیوی) اور عُزیٰ (صبح کا ستارہ) تینوں اس کی بیٹیاں تصور کی جاتی تھیں۔ سب عرب قبیلے قریش کی عزت کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اُن کے اِن چار دیوی دیوتاؤں کا بھی احترام کرتے تھے۔ علاوہ ان دیوی دیوتاؤں کے جس طرح ہر قبیلے کا الگ سردار تھا، اسی طرح الگ دیوتا بھی تھا۔ ان سب دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں یا پتھر کی نشانیاں کعبہ میں رکھی ہوئی تھیں اور حج کے موقع پر عرب مکہ معظمہ پہنچ کر اونٹ، بھیڑ یا بکری کی قربانی دے کر اپنے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ شہروں اور بستیوں میں جو تہذیب کے مرکز تھے یہودیوں، عیسائیوں اور مجُوسیوں کے مذہبی عقائد کا بھی گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ یہودی طویل عرصے سے یمن اور حجاز کے شہروں اور دیہات میں آباد تھے اور اپنے عقائد کی تبلیغ کر رہے تھے۔ عیسائی عقائد شامی اور قبطی عربوں نیز حبشیوں کی معرفت پھیلے تھے جو رومیوں کے زیر اثر عیسائیت قبول کر چکے تھے اور مجوسی خیالات کا اثر اول الحرا کے عربوں کی معرفت اور پھر یمن پر ایرانیوں کے تسلّط سے بڑھا تھا، اور ان خیالات کے زیر اثر ہی یمن کی زرعی بستیوں میں سورج دیوی شمس کو چاند دیوتا المو قاخ کی محبوبہ خیال کیا جانے لگا تھا۔

غرضیکہ عہدِ رسالت سے پہلے جس طرح قبیلے آپس میں لڑ رہے تھے اسی طرح جزیرۃ العرب کے ہر حصے بالخصوص شہروں میں مختلف مذہبی عقیدے برسرِ پیکار تھے۔

قبیلوں کی باہمی رقابتوں اور لڑائیوں کو ختم کر کے عربوں کو متحد کرنے کے لئے قبائلی دیوتاؤں کا خاتمہ اور ایک خدا پر ایمان ضروری تھا۔ چنانچہ چھوٹے اور درمیانہ درجے کے تاجروں اور دستکاروں میں عربوں کو متحد کرنے کے احساس کے ساتھ ہی ساتھ یہودی اور عیسائی عقائد کے زیرِ اثر وحدانیت کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا۔ ان رجحانات کی نمائندگی حنیفیوں کی جماعت کرتی تھی جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قریبی رشتہ دار ابن ابی صامت اور حضرتِ خدیجہ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل بھی شامل تھے۔ غرضیکہ عربوں کے حالات اُس ہمہ گیر تحریک کا تقاضا کر رہے تھے جس کے بانی حضرت محمد رسول اللہ ہیں جو قریش کی ایک شاخ بنو ہاشم کے ایک غریب خاندان میں ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے تھے جنہیں بچپن میں یتیمی اور غریبی سے سابقہ پڑا تھا اور جنہوں نے تجارت کی غرض سے عراق و شام کے سفر میں عربوں کی حالت اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا۔

۶۱۰ء سے ۶۲۲ء تک کا عہدِ رسالت کا مکّی دَور کہلاتا ہے۔ اس دَور میں آنحضرتؐ نے قبائلی دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہوئے اللہ کو جس کے سامنے حسب، نسب اور خاندان کی عظمت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بلا شرکتِ غیرے ساری کائنات کا واحد خالق ماننے، اس کے احکام پر عمل کرنے، غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کی امداد کرنے اور سُود کی شرح کم لینے پر زور دیا۔ یہ سب باتیں پرانے قبائلی نظام پر کاری ضرب لگاتی تھیں۔ اس لئے قریش اُمرا، بالخصوص اموی امرا نے جو پرانے قبائلی نظام و مذہب کے پرستار اور محافظ تھے، نئے مذہب کی اس قدر سخت مخالفت کرنی شروع کی کہ اہلِ مدینہ کی دعوت پر ۶۲۲ء میں آنحضرتؐ کو مسلمانوں کی چھوٹی سی جمعیت سمیت مکہ سے

مدینہ کو ہجرت کرنی پڑی۔

چھوٹے تاجروں، دست کاروں اور کاشت کاروں کی بستی مدینہ میں پہنچتے ہی آنحضرت نے "باطل کو شکست" دینے اور "اللہ کی بادشاہت" قائم کرنے کے لئے جہاد پر زور دیا۔ مدینہ کے خزرج اور اوس دو قبیلوں کے مسلمانوں کے صف میں شامل ہونے سے مسلمانوں کی طاقت مضبوط ہو گئی تھی۔ بدر کے مقام پر ۶۲۴ء میں اہلِ مکّہ سے جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں اہلِ مکہ کی شکست نے پانسہ پلٹ دیا۔ جنگِ اُحد میں اہلِ مکّہ سے شکست کھانے کے باوجود مسلمانوں کی طاقت بڑھنے لگی۔ صدہا سال سے ایک دوسرے کے دشمن قبیلے اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ آخر مکہ کے اموی اُمرا نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور ۶۳۰ء میں مکہ پر مسلمانوں کے قبضہ کے بعد عمان، حضرموت، یمن اور کنداح کے قبیلوں نے اپنے وفد بھیج کر اسلام قبول کر لیا۔

حکومت یعنی فوج، پولیس، نظم و نسق اور عدل کے ادارے اس وقت وجود میں آتے ہیں جب دوسری قوموں کو فتح کرنے سے معاشرہ میں حاکم اور محکوم طبقے پیدا ہو جائیں اور مملکت کی حدود قبیلے تک محدود نہ رہیں۔ مکہ کے دورِ رسالت میں مسلمان ایک چھوٹی سی مظلوم جماعت تھے۔ مدینہ میں انہیں طاقت و اختیارات حاصل ہوئے مگر مکہ معظمہ کی فتح تک ان کے اثر و اقتدار کا دائرہ صرف مدینہ تک محدود رہا اس لئے عہدِ رسالت میں جو اقتصادی سیاسی اور سماجی مسائل حل کرنے کے لئے سامنے آئے وہ مدینہ میں رہنے والے پانچ چھ ہزار کسانوں، دست کاروں اور چھوٹے تاجروں کے مسائل تھے۔ آنحضرتؐ مسلمانوں کی چھوٹی سی جمعیت کے سردار، مذہبی رہنما، قاضی القضات اور امیر عسکرِ مجاہدین تھے۔ اور مہاجر و انصار صحابہ کرامؓ مجلسِ شوریٰ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ غرضیکہ قبائلی نظام

میں جو حیثیت سردارِ قبیلہ کی تھی وہی حیثیت آنحضرتؐ کی مسلمانوں کی جمعیت میں تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ قبیلے کی بنیادیں خون کے رشتہ پر ہوتی ہیں اور مسلمانوں کی جماعت خون کے رشتہ پر نہیں تھی۔ اُس میں نہ صرف مختلف عرب قبیلوں کے افراد شامل تھے بلکہ حبشی اور ایرانی بھی تھے۔ حدود کی توسیع کا آغاز فتح مکہ کے بعد ہوا اور اس فتح کے دو سال بعد یعنی ۶۳۲ء میں آنحضرتؐ رحلت فرما گئے۔ غیر عربوں کو فتح کرنے کا آغاز آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ہوا اس لئے حکومت کے تمام ادارے وجود میں لانے کا مسئلہ بھی ان کے بعد سامنے آیا اور حضرتِ عمر فاروق نے ان اداروں کو وجود میں لانے کی ابتدا کی۔

آنحضرتؐ کے فوت ہوتے ہی سب سے پہلا مسئلہ ان کے جانشین کا سامنے آیا۔ فتح مکہ کے بعد حدودِ مملکت کی توسیع، اموی امرا اور جزیرۃ العرب کے تقریباً تمام قبیلوں کی مسلمانوں کی صفوں میں شمولیت نیز فتوحات کے سبب سے مالِ غنیمت کی آمد اور اس کی تقسیم نے حالات کو بدلنا اور جاہ پسندی کے جذبات کو اُبھارنا شروع کر دیا تھا چنانچہ آنحضرتؐ کے فوت ہوتے ہی خلافت کے کئی مدعی کھڑے ہو گئے مگر حضرت عمر فاروقؓ نے تمام مہاجر و انصار صحابہ کرام اور مدینہ میں موجود قبائلی سرداروں کو سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھا کیا اور حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں خلیفۃ الرسول اللہ تسلیم کرنے میں سبقت کی۔ ایک طرف یہ تجویز بدر سر قبیلی روایات کے مطابق تھی۔ صحابہ کرام میں عمر کے اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ سب سے بڑے تھے۔ دوئم یہ کہ وہ سب سے زیادہ نیک اور حلیم الطبع نیز مہاجر قریش، آنحضرتؐ کے خسر اور پہلے تین ایمان لانے والوں میں سے تھے۔ چنانچہ سب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں خلیفۃ الرسول اللہ تسلیم کر لیا۔ ۶۳۴ء میں جب حضرت ابوبکرؓ کو علالت سے موت کا احساس ہوا تو انہوں نے حضرت عبدالرحمان بن عوف

اور حضرت عثمان سے مشورہ کر کے حضرت عمر فاروقؓ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرام نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں خلیفہ تسلیم کر لیا۔ ۶۴۴ء میں جب حضرت عمر ایک ایرانی غلام کے خنجر سے زخمی ہوئے اور حالت نازک ہو گئی تو انہوں نے تیسرے خلیفہ کا فیصلہ کرنے کے لئے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت زبیر اور حضرت طلحہؓ یعنی خلافت کے چھ امیدواروں پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کمیٹی کے پانچ ارکان نے جو اس وقت موجود تھے، تیسرے خلیفہ کا فیصلہ کرنے کے لئے سب اختیارات عبدالرحمان بن عوف کو دے دیئے جو خود اس عہدہ کی امیدواری سے دست بردار ہو گئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ حضرت عثمان کے حق میں کیا، اور سب صحابہ کرام نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں تیسرا خلیفہ تسلیم کر لیا۔ چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کا انتخاب ۶۵۶ء میں حضرت عثمانؓ کے واقعہ شہادت کے بعد عمل میں آیا۔ انہیں خلیفہ منتخب کرنے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو مصر اور عراق کے اموی گورنروں کے ظلم و ستم اور رشوت خوری کے خلاف شکایات لے کر آئے تھے اور جن کی ہنگامہ آرائی سے حضرت عثمانؓ کی شہادت کا رنجدہ واقعہ ہوا تھا۔ حضرت علیؓ کی خلافت کو اوّل حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ نے چیلنج کیا۔ بصرہ کے قریب جنگ ہوئی جس میں حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ ہلاک ہو گئے۔ اس جنگ سے حضرت علیؓ کو فرصت ملی تھی کہ ۶۵۷ء میں شام کے اموی گورنر امیر معاویہ کی سرکردگی میں سب اموی گورنروں اور فوجی افسروں نے بغاوت کر دی۔ دریائے فرات کے مغربی کنارے پر صفین کے میدان میں زبردست معرکہ پڑا۔ امیر معاویہ کی

شامی فوجوں کو حضرت علیؓ کی عراقی فوجوں سے شکست ہونے والی تھی کہ معاویہ نے قرآن کے اوراق نیزوں سے باندھ کر بلند کئے اور صلح کی درخواست کی۔ جنگ ملتوی ہوئی، مگر جھگڑا جاری رہا۔ ۶۶۱ء میں حضرت علیؓ ایک خارجی عبدالرحمان بن ملجم کے ہاتھوں کوفہ میں شہید ہوئے تو امیر معاویہ نے اپنے خلیفۃ المسلمین ہونے کا اعلان کر دیا۔ خلافتِ راشدہ کا دور جو قبائلی نظام اور جاگیرداری نظام کے درمیان ایک عبوری دور کی نمائندگی کرتا تھا، بنوامیہ کے برسرِ اقتدار آتے ہی ختم ہوگیا۔ اس کی جگہ جاگیرداری نظام سے تعلق رکھنے والی مطلق العنان بادشاہت نے لے لی

جاگیرداری بادشاہت کی نشوونما کے لئے قبیلوں کا اتحاد ایک سردار، امیر، خلیفہ یا بادشاہ کے تحت پہلی شرط ہے۔ یہ تاریخی فریضہ مدینہ منورہ کی قدیم نیم قبائلی اور نیم شہری ریاست نے اسلام کا جھنڈا بلند کر کے رسالت اور پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق کے عہد میں ادا کیا۔ پہلے خلیفہ کا انتخاب بدرِ سر قبیلی روایات کے مطابق ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ طریقہ بدل گیا۔ بنوامیہ کے عہد میں خلافت کا عہدہ وصیت کے مطابق ورثا کو ملنے لگا۔ جاگیرداری بادشاہت کے قیام کے لئے دوسری شرط غلام داری کے نظام کا خاتمہ ہے۔ جس طرح بربر قبیلوں نے شمال اور شمال مشرق سے حملے کر کے قدیم روما کی غلام داری سماج کو یورپ میں درہم برہم کیا تھا۔ اسی طرح پہلے دو خلفاء راشدین کے عہد میں عربوں نے عراق اور ایران میں ساسانیوں، اور شام، فلسطین، لبنان اور مصر میں رومیوں کے غلام داری نظام حکومت کو جس پر زوال کے بادل چھائے ہوئے تھے درہم برہم کر دیا۔ تیسری شرط امیر، خلیفہ یا بادشاہ کی طرف سے وفادار قبائلی سرداروں، گورنروں اور افسروں میں جاگیروں کی تقسیم

ہے۔ جاگیریں عطا کرنے کا سلسلہ حضرت عثمان کے عہد میں شروع ہوا اور ان کے عہد میں ہی اموی گورنر اور فوجی افسر نیز قبائلی سردار اور سرکردہ مجاہدین جاگیریں حاصل کر کے ایک بااثر اور مضبوط طبقہ بن گئے۔

غرضیکہ عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایران کے زرخیز خطوں کو فتح کرنے کے بعد عرب وہ پُرانے عرب نہ رہے جو عرب کے ریگستانوں میں چشموں یا نخلستان کے قریب چراگاہوں میں کھجور کے درختوں تلے اُون کے بُنے ہوئے کپڑے کے خیموں میں رہتے، رات کے وقت اونٹ چراتے اور سفر کرتے اور اونٹنی کا دودھ پیتے اور کھجوریں کھاتے تھے۔ فتوحات، نیز دولت، غلاموں اور کنیزوں نے ان کے روزی کمانے کے وسیلے بدل دیئے، اقتصادی اور سماجی حالات بدل دیئے، خیالات اور نظریے بدل دیئے، ارادے اور مقاصد بدل دیئے۔ مدینہ کی نیم قبائلی اور نیم قدیم شہری ریاست وقت کے تقاضوں کے مطابق نہ رہی، جس طرح فوجی کمانڈروں نے دوسرے ملکوں کو فتح کر کے روم قدیم کی شہری ریاست کو مطلق العنان بادشاہت میں بدل دیا تھا اسی طرح حضرت عثمانؓ کے عہد میں فوجی کمانڈر اور گورنر بن کر اموی اُمرا نے مدینہ کی نیم قبائلی اور نیم شہری ریاست کو ختم کر کے عرب قبائلی سرداروں جاگیرداروں اور امیر تاجروں کے مفاد کی نمائندہ اور محافظ مطلق العنان بادشاہت قائم کر دی اور عربوں کی قدیم قبائلی سماج اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ کی نیم قبائلی اور نیم شہری ریاست سے ایک ایسی سماج کا نشو و نما ہوا جس میں وقت کے تقاضوں کے مطابق زوال پذیر قبائلی نظام، رُو بہ تنزل غلام شاہی اور اُبھرتی ہوئی جاگیر شاہی تینوں کی خصوصیات موجود تھیں۔ تاریخی دور کا تقاضا یہی تھا۔ اگر بنو امیہ

کے بجائے حضرت علیؓ یا حضرت زبیرؓ کے فرزند کامیاب ہوتے" نظام تب بھی یہی قائم ہونا تھا۔ بنو امیہ کے کامیاب ہونے کی پہلی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں تمام کلیدی عہدوں پر قبضہ کر کے قبائلی سرداروں، فوجی کمانڈروں اور سرکردہ مجاہدوں کو دولت جمع کرنے اور جاگیر دار بننے میں مدد دی تھی۔ چنانچہ با اثر قبائلی سرداروں، فوجی کمانڈروں اور سرکردہ مجاہدوں کا وہ گروہ جو امیر اور جاگیر دار بن چکا تھا، اپنے حقوق و مراعات کی حفاظت کے لئے امویوں کا حامی اور مددگار تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ قریش کے مختلف خاندانوں میں خلافت کے لئے "تگ و دو ہو رہی تھی اور عرب اس طرف متوجہ ہونے کی بجائے صحرائے عرب سے نکل کر عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایران کے زرخیز خطوں میں آباد ہو رہے تھے اور اموی اُمرا انہیں آباد ہونے میں مدد دے رہے تھے۔

بنو امیہ اور بنو عباس

بہرکیف رسالت اور خلافتِ راشدہ کے عہد کے مدینہ میں نیم قبائلی اور نیم شہری ریاستی نظام، عربوں کے ایک مخصوص اقتصادی، سیاسی اور سماجی ارتقا کا پرتو تھا۔ حالات تبدیل ہوتے ہی ایک نئے نظام کا نشو و نما ہوا جس میں زوال پذیر قبائلی نظام، رُو بہ تنزل غلام شاہی اور ابھرتی ہوئی جاگیر شاہی، تینوں کی خصوصیات موجود تھیں اور عرب قبائلی سرداروں، جاگیرداروں اور غلاموں کی خرید و فروخت کرنے والے عرب تاجروں کے مفاد کی نمائندہ اور محافظ بنو امیہ کی مطلق العنان بادشاہت نے انہی عراقی، شامی، مصری اور ایرانی کاشت کاروں کو جنہیں پہلے دو خلفائے راشدین کے عہد میں ساسانی اور رومی جاگیرداروں کی غلامی سے آزاد کیا گیا تھا، عرب جاگیرداروں کا عملی طور پر زرعی غلام بنا دیا

اور غیر عرب مسلمانوں سے وہ حقوق (مثلاً وظیفہ لینے، جزیہ نہ دینے وغیرہ کے حقوق) چھین لیئے جو انہیں ابتدائی دور میں ملے تھے۔ صرف یہی نہیں، انہوں نے دوسری قوموں کی جو اُن سے زیادہ مہذب و متمدن تھیں، مادری زبانوں کو دبایا اور عربی زبان کو ان پر ٹھونسا اور ان تمام متشددانہ کارروائیوں کو جائز و صحیح ثابت کرنے، نیز اس اتحاد کو روکنے اور توڑنے کے لئے جو عام عربوں اور غیر عرب مسلمانوں میں رشتے ناطے یا ایک ہی جیسے اقتصادی حالات سے دوچار ہونے کے سبب سے ہو رہا تھا، یہ نظریہ پیش کیا کہ پیغمبرِ اسلام چونکہ عرب تھے اس لئے عرب خدا کے محبوب ہیں اور باقی سب قوموں سے بلند ہیں۔ اور قرآن مجید چونکہ کلام الٰہی ہے اور وہ عربی میں ہے، اس لئے خدا کی زبان عربی ہے اور باقی سب قوموں کی زبانوں سے بلند اور افضل ہے۔ چنانچہ عربوں کے اثر و اقتدار اور حکومت کو ختم کرنے کے لئے جب غیر عرب مسلمانوں بالخصوص عراقیوں اور ایرانیوں نے جد و جہد شروع کی تو عربوں کے افضل اور برتر ہونے کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لئے جہاں انہوں نے احادیث کی تحقیق و تفتیش اور اسلام کی تبلیغ میں عربوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر حصہ لیا، وہاں انہوں نے عربی کو خدا کی زبان ماننے سے بھی انکار کیا۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اعلانیہ کہنا شروع کیا کہ قرآن مجید مخلوق ہے۔[ل]

بنو امیہ کی حکومت صرف ان کے حامی اور وفادار عرب اُمرا کی حکومت تھی۔ اس کے اپنے گورنر، نائب گورنر، فوجی افسر اور عامل تھے جو عرب فوج کے بل بوتے پر لوگوں سے ٹیکس وصول کرتے اور قدیم جاگیرداروں سمیت تمام مقامی آبادی کو دبائے

ل اموی خلیفہ ہشام (۷۲۴ - ۷۴۳ء) کے عہد میں قرآن مجید کو مخلوق قرار دینے کے جرم میں جعد بن درہم، غیلان دمشقی وغیرہ کو موت کی سزا دی گئی تھی۔

رکھتے تھے۔ چنانچہ حکومت کا سارا ڈھانچہ سطحی تھا۔ مقامی آبادی میں اس کی جڑیں نہیں تھیں یہی وجہ ہے کہ ایرانی اور عراقی کاشتکاروں کی بغاوتوں، غیر عرب مسلمانوں کی اموی حکمرانوں سے نفرت کے مظاہروں اور عرب اُمرا کی دو مضبوط پارٹیوں بنو کلب[1] اور بنو قیس[2] میں رقابت و مخالفت کے سبب سلطنت بنو امیہ کے ہر حصے میں خانہ جنگی، نیز فتوحات کے رُک جانے سے تجارتی اور مالی بحران اور اس بحران کے سبب عوام میں بے چینی اور اضطراب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جب بنو عباس نے ایرانی کاشتکاروں کی مدد سے خراسان میں بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تو اس بغاوت کی خبر سنتے ہی سارے ایران و عراق کے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور تین سال کے قلیل عرصہ میں سپین اور مغربی افریقہ سے ملتان اور پامیر کے پہاڑوں تک پھیلی ہوئی بنو امیہ کی وسیع سلطنت کا ڈھانچہ ریت کی دیوار کی طرح گر کر نابود ہو گیا اور ہسپانیہ کے علاوہ باقی سب ممالک میں جہاں بنو امیہ کا سفید جھنڈا لہراتا تھا، ۷۵۰ء میں بنو عباس کا سیاہ جھنڈا لہرانے لگا۔

بنو امیہ کی طرح بنو عباس بھی مستبد اور مطلق العنان بادشاہ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ بنو عباس نے چونکہ ایرانیوں اور عراقیوں کی سرگرم حمایت اور امداد سے بنو امیہ کو گرایا اور طاقت حاصل کی تھی، اس لئے انہوں نے وہ تمام حقوق و مراعات دے کر جو عرب اُمرا کو حاصل تھے غیر عرب مسلمان اُمرا کو حکمران طبقے میں شامل کر لیا۔

طبقاتی بغاوتوں کا اثر

بنو امیہ کے عہد میں حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا وسیلہ مالِ غنیمت تھا چنانچہ فتوحات

---

[1] یمنی اُمرا کی پارٹی
[2] حجازی اُمرا کی پارٹی

رُک جانے کے سبب جب مالِ غنیمت کی آمد بند ہوگئی تو تجارتی اور مالی بحران پیدا ہو گیا، اور بنو امیہ کے نظام حکومت پر زوال کے بادل چھا گئے۔ بنو عباس نے حکومت کی آمدنی بڑھانے اور حکومت کی بنیادوں کو زیادہ مستحکم کرنے کے لئے زراعت، صنعت اور تجارت کو فروغ دیا۔ تجارت اور صنعت کو فروغ دینے کے لئے انہوں نے دستکاری کی حوصلہ افزائی کی، سڑکوں کا جال بچھایا، تاجروں کے قافلوں کی حفاظت کا بندوبست کیا اور کارواں سرائیں تعمیر کیں۔ اور زراعت کو ترقی دینے کے لئے انہوں نے نہریں جاری کیں اور تالاب کھدوائے، تجارت سے حکومت کی آمدنی بڑھانے کے لئے محاصل کا ہمہ گیر نظام قائم کیا اور زراعت سے حکومت کی آمدنی میں کئی گنا اضافہ کرنے کے لئے انہوں نے ایک ایسے جاگیرداری نظام کی حوصلہ افزائی کی جس کے ماتحت جاگیردار کاشتکاروں سے بٹائی کی صورت میں لگان وصول کر کے اس کا ایک مقررہ حصہ بطور مالیہ یا خراج حکومت کو دیتے تھے۔

عباسیوں نے بنو امیہ کی حکومت کو لادینی اور غیر اسلامی کہہ کر مذمت کرتے ہوئے یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ ان کا مقصد خلافتِ راشدہ ایسی حکومت قائم کرنا ہے چنانچہ ایرانی اور عراقی کاشتکاروں نے صرف اس امید پر عباسیوں کی حمایت کی تھی کہ جس طرح پہلے دو خلفاء راشدین کے عہد میں ساسانی اور رومی جاگیرداروں کی غلامی سے انہیں آزادی ملی تھی، اسی طرح عباسیوں کے برسر اقتدار آنے سے اموی اُمرا کے جاگیری نظام سے نجات مل جائے گی۔ اس کے برعکس عباسیوں نے جب کاشتکاروں اور دستکاروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو پہلے سے زیادہ غصب کرنے کی بنیادوں پر جاگیرداری اور حکومت کے مالی نظام کو مستحکم کیا تو حالت کاشتکاروں اور دستکاروں کی پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ چنانچہ دوسرے عباسی خلیفہ منصور (۷۵۴ تا ۷۷۵ء) کے عہد سے ایران، وسط ایشیا، عراق اور شام میں غیر ملکی حکمرانوں اور جاگیرداروں نیز ان کے حامی اور مددگار مقامی جاگیرداروں

کے خلاف کاشت کاروں، دست کاروں اور غلاموں کی طبقاتی بغاوتوں[1] کا دور شروع ہوا جو مسلسل پونے دو سو سال رہا۔

ان بغاوتوں نے جنہیں حکمرانوں کی فوجی کارروائیوں نے سختی سے دبا دیا پہلی بات یہ کی کہ عباسیوں کے مضبوط مرکزی نظامِ حکومت کو اپاہج اور کمزور کر دیا۔ ۹ ویں عباسی خلیفہ واثق باللہ (۸۴۲ء تا ۸۴۷ء) کے بعد خلافتِ عباسیہ پر زوال کے بادل چھا

---

[1] ۷۵۵ء میں سن باد اور ۷۶۷ء میں استاد سیس کی رہنمائی میں خراسان کے کاشتکاروں نے بغاوت کی اور ۷۷۵ء سے ۷۸۲ء تک ہاشم بن حاکم المعروف مقنّع کی سرکردگی میں خراسان اور تاجکستان کے کاشتکاروں، زرعی غلاموں اور دستکاروں کی بغاوت ہوئی جو "سفید پوش کسانوں" کی بغاوت کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس بغاوت کے چند سال بعد بحیرہ خزر کے مشرق میں جرجان کے کاشتکاروں نے بغاوت کر دی جو سرخ لباس پہننے کے سبب "سُرخ پوشوں" کی بغاوت بھی کہلاتی ہے۔ ۹ ویں صدی کے شروع میں ایک بیس سالہ نوجوان بابک خورمی کی سرکردگی میں آذربائیجان کے کاشت کاروں اور زرعی غلاموں نے بغاوت کی جسے تیس سال تک عباسی فوجیں دبانے میں ناکام رہیں۔ ۸۵۲ء میں بصرہ کے قریب شورے کی کانوں میں کام کرنے والے حبشی غلاموں نے ایک ایرانی علی بن محمد کی رہنمائی میں بغاوت کی۔ یہ بغاوت آگ کی طرح عراق، کالدیا اور شمالی شام کے بڑے بڑے کھیتوں، کانوں اور ورکشاپوں میں کام کرنے والے غلاموں میں پھیل گئی اور ۸۸۲ء تک رہی۔ ۸۹۰ء سے ۹۳۰ء تک عراق، کالدیا اور بحرین کے غلاموں، زرعی غلاموں، کاشت کاروں اور دست کاروں نے بغاوت کی جو تحریک کے بانی ایک عراقی کسان ہمدان قرامطہ کے نام سے قرامطہ کی بغاوت مشہور ہے۔ یہ بغاوت ابو سعید الجنابہ کی سرکردگی میں ہوئی تھی۔

گئے۔ دوسری یہ کہ سرکاری کانوں اور ورکشاپوں نیز بڑے بڑے کھیتوں میں کام کرنے والے غلام آزاد ہو گئے۔ تیسری یہ کہ عرب جاگیر دار اور ان کے حامی و مددگار مقامی جاگیر دار دونوں بہت کمزور ہو گئے اور چوتھی بات یہ کہ ان بغاوتوں نے جو غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تھیں قومی جذبوں کو بیدار کر کے مقامی صنعت اور تجارت کو ترقی دینے میں مدد دی۔ چنانچہ تجارتی راستوں پر آباد صنعتی اور تجارتی شہروں کے تاجروں نے ترقی کر کے عرب تاجروں کی اجارہ داری پر کاری ضرب لگائی اور جس طرح ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کے تاجر ترقی کر کے قومی بادشاہتوں کے سنگِ بنیاد دیتے تھے اسی طرح عباسیوں کے ماتحت ممالک میں تاجروں نے صوبائی گورنروں[1]، سابق غلام افسروں[2] اور گورنروں، باغی فوجی[3] سپاہیوں پس ماندہ

---

[1] عباسی خلفاء نے ایک مقررہ رقم ہر سال بغداد بھیجنے کی شرط پر شمالی افریقہ میں بنو اغلب خراسان میں طاہریوں اور وسط ایشیا میں سامانیوں کے خاندان کو گورنری عطا کی تھی۔ جب عباسیوں کی حکومت کمزور ہو گئی تو گورنروں کے یہ خاندان آزاد ہو کر خود مختار شاہی خاندان بن گئے۔

[2] نویں عباسی خلیفہ واثق باللہ کے بعد ایک سو سال تک حقیقی حکمران وسط ایشیا کے ترک غلاموں (مملوک) کی فوج کے افسر تھے جو امیر الامرا کہلاتے تھے۔ سلطنت غزنویہ کے بانی الپتگین اور سبکتگین سامانیوں کے غلام تھے جو ترقی کر کے فوجی افسر اور گورنر اور پھر آزاد بادشاہ بنے۔ مصر کا احمد بن طولون بھی ترک غلام تھا جو مصر کا گورنر اور پھر آزاد بادشاہ ہوا۔

[3] صفاریہ خاندان کا بانی یعقوب بن لیث جس نے ۸۷۰ء میں طاہریوں سے سیستان خراسان اور طبرستان چھین کر اپنی حکومت قائم کی۔ طاہریوں کی فوج میں سپاہی تھا۔

قبیلوں کے سرداروں کو اپنی آزاد اور خود مختار بادشاہتیں اور دوسرے ملکوں کو فتح کر کے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنے میں سنگِ بنیاد کا کام کیا اور خلفاء بنو عباس اس قدر کمزور ہو گئے کہ ان کا عملی طور پر کام صرف یہ رہ گیا کہ اپنی طاقت سے حکومت قائم کرنے والوں کی فرمانروائی کو تسلیم کر کے انہیں امیر الاُمرا سلطان پاشا شرق و غرب کے خطابات دے دیا کریں۔ اسی پر اکتفا نہیں، امویوں نے ہسپانیہ میں اور فاطمیوں نے شمالی افریقہ اور مصر میں اپنی حکومت قائم کر کے خلیفۃ المسلمین ہونے کے اعلان کر دیئے۔ غرضیکہ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ایک کے بجائے تین خلیفۃ المسلمین اور سینکڑوں کی تعداد میں چھوٹی بڑی ریاستیں، بادشاہتیں اور سلطنتیں تھیں۔

مشرقی ممالک میں جمود و تعطل

یورپ میں بادشاہ ملک کے فرمانروا اور زمینوں کے مالک تھے۔ چنانچہ اپنے رشتہ داروں، وفاداروں او معتمد افسروں کو جاگیریں عطا کرتے ہوئے انہوں نے وہی حقوق دیئے جو نظری اور عملی طور پر انہیں خود حاصل تھے۔ غرضیکہ وہ اپنی جاگیروں میں فرمانروا بھی تھے اور زمینوں کے مالک بھی۔ زمینوں کے تیسرے

ے شیعہ بویہ خاندان کے امیر الامرا جو ۹۴۶ء سے ۱۰۵۵ء تک عباسی خلفا کو تخت پر بٹھاتے اور اتارتے رہے۔ شمالی ایران کے پہاڑی قبیلوں کے سردار تھے۔ سلجوق وہ ترکمان ہیں جو دسویں صدی کے وسط میں کرغزیہ کے کہستان سے آئے تھے اور جنہوں نے غزنویوں کے عہد میں خراسان اور دریائے آموں کے درمیانی علاقہ میں آباد ہونے کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔

مالک حقیقی کاشتکار تھے۔ اِن تینوں مالکوں کے درمیان حقوق و اختیارات کی تخصیص اور تقسیم کے لئے بارھویں صدی سے لے کر ۱۷ ویں صدی تک جدوجہد ہوئی۔ جاگیرداروں نے بادشاہ کے حقوق ملکیت کو چیلنج کیا اور کاشت کاروں نے جاگیرداروں کے حقوق ملکیت کے خلاف بغاوتیں کیں۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ صرف فرمانروا رہ گئے، جاگیردار زمینوں کے مالک بن گئے اور کاشتکاروں کو مزارعہ بنا دیا گیا۔

ایشیائی ممالک بالخصوص مسلمانوں کے زیر اثر ممالک میں جہاں کاشت کرنے کے لئے زمین وسیع تھی، نظری اعتبار سے فرمانروا اور زمینوں کا مالک خدا تھا۔ بادشاہ اس کے صرف خلیفہ تھے۔ چنانچہ جاگیریں عطا کرتے ہوئے انہوں نے جاگیرداروں کو زمینوں کا مالک نہیں بنایا۔ انہوں نے وہی حقوق دیئے جو انہیں خود حاصل تھے، یعنی مالیہ اکٹھا کر کے اس میں سے ایک مقررہ حصہ بادشاہ کو بھیج دیتے تھے اور باقی حصہ اپنی امیرانہ شان کو برقرار رکھنے اور ملک کے نظم و نسق نیز تعمیرات عامہ پر خرچ کرتے تھے۔ کاشت کاروں کو زمین کی کاشت کرنے کا حق حاصل تھا۔ جاگیردار اور بادشاہ کو سروکار صرف مالیہ وصول کرنے سے تھا، جو گاؤں کی پنچائتیں کاشت کاروں سے اکٹھا کر کے جاگیردار یا حکومت کو ادا کرتی تھیں۔ چنانچہ ایشیائی ممالک میں بادشاہوں، جاگیرداروں اور کاشت کاروں کے درمیان حقوق و اختیارات کی تقسیم و تخصیص کے لئے کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ بنو امیہ، بنو عباس اور ان کے بعد دوسرے شاہی خاندانوں کے عہد میں کسانوں کی جتنی بغاوتیں ہوئیں وہ مالیہ وصول کرنے کے حق کے خلاف نہیں تھیں۔ یہ

بغاوتیں لگان یا مالیہ میں اضافہ کے خلاف تھیں۔ اسی طرح جاگیرداروں نے بادشاہوں کے حقوق و اختیارات کو کم کرنے کے لئے کبھی کوئی جد و جہد نہیں کی۔ جاگیردار ابھر کر پرانے شاہی خاندان کو گراتے اور اپنے خاندان کو شاہی خاندان میں منتقل کرتے رہے مگر کسی جاگیردار نے بادشاہ کے حقوق و اختیارات کو نظری اعتبار سے چیلنج کر کے جد و جہد نہیں کی۔

قرون وسطیٰ کے یورپ میں اقتصادی اور سیاسی اکائی (یونٹ) جاگیری ریاست تھی۔ ان جاگیری ریاستوں میں نئے صنعتی اور تجارتی شہروں نے اُبھر کر اقتصادی اعتبار سے دیہات کو اپنا دست نگر اور محتاج بنایا اور تاجروں اور صنعتی ورکشاپوں کے مالکوں نے ٹریڈ گلڈوں اور پنچائتوں (کمیونوں) میں منظم ہو کر اقتصادی اور سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے جد و جہد شروع کی۔ پہلے انہوں نے ازمنہ وسطیٰ کی بلدیات کو ایک ہتھیار بند اور خود مختار جماعت بنایا، اس کے بعد ہر جاگیری ریاست کے الگ محصولاتی نظام کو ختم کرنے کے لئے بڑی بڑی بادشاہتوں کے قیام میں مدد دے کر اپنے آپ کو اقتصادی اور سیاسی طور پر مضبوط کیا اور پھر جب کم سے کم قیمت پر کچا مال خریدنے اور کم سے کم اُجرت پر کام کرنے والے اجرتی مزدور حاصل کرنے اور تیار شدہ اشیاء کو دیہات میں فروخت کرنے کے راستے میں جاگیرداری نظام حائل ہوا تو انہوں نے جاگیرداری بادشاہت کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی طاقت کو کمزور یا ختم کر کے طاقت و اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینے کی جد و جہد شروع کی۔ جاگیرداری مطلق العنان بادشاہت کے پرستار تصورات، خیالات مذہبی

عقائد اور اخلاقی نظریے شاہ کو ظل اللہ قرار دیتے تھے۔ جدید سرمایہ داری کے حامی فلسفیوں مثلاً فرانس کے والٹیر اور روسیو وغیرہ نے آزادی، مساوات اخوت، عوام کی حاکمیت اور جمہوریت کے اقتصادی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی تصورات پیش کیے۔ سرمایہ داروں نے اقتصادی جماعتوں کے ساتھ ہی ساتھ اپنی سیاسی پارٹیاں قائم کیں اور ان سیاسی پارٹیوں کی رہنمائی میں جمہوری انقلابات نے جاگیرداروں اور بادشاہوں سے طاقت و اختیارات چھین کر مزارعوں اور کاشت کاروں کو جاگیری نظام سے آزادی دلائی اور پرانے جاگیرداری نظام کے کھنڈرات پر نئے اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام کی عمارت تعمیر ہوئی۔

ایشیا میں شہروں کی صنعت چونکہ بادشاہوں، گورنروں، درباریوں اور اونچے سرکاری افسروں کے عیش و آرام کی قیمتی چیزیں اور فوج کے لئے سامان جنگ تیار کرتی تھی، اس لئے وہ دیہات کے مضبوط و مستحکم خودکفیل زرعی اور صنعتی نظام کو درہم برہم کر کے دیہاتی اقتصادیات کو شہروں کی صنعت و تجارت کے تابع اور دست نگر بنانے میں ناکام رہی، شہروں کے دستکار اور تاجر جنہوں نے دیہاتی عوام کو ارزاں قیمت پر اشیاء فروخت کرنے کے لئے سائنس کے نئے نئے انکشافات کی بنیادوں پر پیداوار کے اوزار اور طریقے بدلنے تھے، بنیادی طور پر کمزور تھے اور اس کمزوری کے سبب نہ چھوٹی چھوٹی ورکشاپیں بڑے بڑے کارخانوں میں تبدیل ہوئیں اور نہ تاجروں اور دستکاروں میں سے چند ابھر کر کارخانہ دار، بنکوں کے مالک اور ڈائرکٹر بنے۔ صنعتی و تجارتی شہروں میں دستکاروں اور تاجروں نے اپنے آپ کو ٹریڈ گلڈوں میں منظم کیا اور طوائف الملوکی کے دور میں کئی شہروں مثلاً

ہسپانیہ میں قرطبہ[۱] اور سیوائل میں دستکاروں اور تاجروں نے جمہوریتیں بھی قائم کیں مگر دستکاروں اور تاجروں کی بنیادی اقتصادی اور سیاسی کمزوری کے باعث یہ جمہوریتیں زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکیں۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بیرونی حملے کے وقت شہری دستکاروں اور تاجروں نے اپنے ٹریڈ گلڈوں کے ماتحت مسلح ہو کر دشمن کا بہادری سے مقابلہ بھی کیا[۲] مگر بنیادی طور پر کمزور ہونے کے سبب مکمل فتح حاصل نہ کر سکے۔

۱؎ گیارھویں صدی کے شروع میں ہسپانیہ میں بنوامیہ کا سورج غروب ہو جانے سے جب سارے ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی، تو قرطبہ کے تاجروں اور دست کاروں نے جو بہت مضبوط تھے جمہوریت قائم کی۔ اس جمہوریت کو جو چالیس برس قائم رہی ۱۰۷۵ء میں سیوائل (اشبیلیہ) کے بادشاہ معتمد باللہ نے جو بنو عباد میں سے تھا، قرطبہ پر قبضہ کر کے ختم کر دیا۔ جمہوریت ۱۲۴۶ء میں سیوائل کے تاجروں اور دستکاروں نے بھی قائم کی جو صرف دو برس رہی۔ قسطالہ کی عیسائی فوجوں نے ۱۲۴۸ء میں حملہ کیا اور پندرہ مہینے بہادری سے ان کے خلاف لڑنے کے بعد یہ جمہوریت ختم ہو گئی۔

۲؎ تیرھویں صدی کے شروع میں چنگیز خاں کی منگول اور تاتاری فوجوں نے حملہ کیا، تو وسط ایشیا کے ترک سلطان خوارزم شاہ کے گورنروں، سپہ سالاروں اور با اثر جاگیرداروں نے اپنی جاگیریں اور حقوق بچانے کے لئے عوام سے غداری کی اور اطاعت قبول کر لی مگر وسط ایشیا کے مشہور صنعتی، تجارتی اور تہذیبی شہروں مثلاً سمرقند، بخارا، خوارزم، مرو، ہرات اور بلخ کے دست کاروں اور تاجروں نے جو ٹریڈ گلڈوں میں منظم تھے، بڑی بہادری سے چنگیزی فوجوں کا مقابلہ کیا اور فتح کے بعد انتقام لینے کے لئے چنگیز خاں نے ہر شہر میں لاکھوں کی تعداد میں مردوں، بچوں اور عورتوں کو قتل کر کے اُن کی کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کئے اور وسط ایشیا کے تمام مشہور صنعتی، تجارتی اور تہذیبی شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا۔ (باقی صفحہ ۸۳ پر)

قرونِ وسطیٰ کے ایشیائی ممالک میں نئی پیداواری طاقتوں کی اس بنیادی کمزوری کا اثر صرف اقتصادی، سیاسی اور سماجی زندگی تک محدود نہیں رہا۔ اس کمزوری کا اثر مشرقی ممالک کی علمی اور تہذیبی ترقی پر بھی پڑا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۲) منگول حکمرانوں نے اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے منگول اور تاتار سرداروں اور تاجک، عرب اور ترک نوابوں اور جاگیرداروں کو خاص مراعات اور حقوق عطا کئے اور کاشتکاروں تاجروں اور دستکاروں پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھا دیا۔ چنانچہ سمرقند بخارا اور خوارزم کے کاشتکاروں تاجروں اور دستکاروں نے منگول حکمرانوں اور مقامی جاگیرداروں کے خلاف کئی مرتبہ بغاوت کی۔ سب سے مشہور بخارا کے تاجروں، دستکاروں اور کاشتکاروں کی بغاوت ہے جو انہوں نے ۱۲۳۸ء میں بخارا کے قریب تراب نامی ایک گاؤں کے دستکار محمد ترابی کی سرکردگی میں کی۔ محمد ترابی منگولوں کے خلاف جنگ میں ہلاک ہوگیا اور بغاوت کامیابی حاصل کرنے کے بعد دب گئی۔

۱۳۶۵ء میں منگولستان کے منگولوں نے سمرقند پر حملہ کیا۔ والیٔ شہر حسین اور اس کا سپہ سالار تیمور لنگ دونوں شہر کو حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گئے مگر ابوبکر کیلوی نامی ایک پارچہ باف کی سرکردگی میں شہر کے دستکار اور تاجر اس بہادری سے لڑے کہ منگول شکست کھا کر بھاگ گئے اور سمرقند کے تاجروں اور دستکاروں نے ابوبکر کی سرکردگی میں جمہوری حکومت قائم کی جو بہت تھوڑا عرصہ قائم رہی۔ حسین اور تیمور لنگ دونوں واپس آگئے۔ ابوبکر کو اپنے فوجی کیمپ میں مدعو کیا اور گرفتار کرکے قتل کر دیا۔ جمہوریت ختم ہوگئی۔ شہر پر حسین اور تیمور لنگ نے قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کے پانچ سال بعد تیمور لنگ نے حسین والیٔ سمرقند سے تاج چھین کر اپنے سر پر رکھ لیا اور نیم وحشی چغتائی قبیلوں کو فوج میں بھرتی کرکے پہلے تمام وسط ایشیا کو فتح کیا اور پھر جنوب مشرقی روس، ایران، قفقاز، افغانستان اور شمالی ہندوستان کو تاراج کیا اور ان ملکوں کے فرمانرواؤں، شہزادوں اور (باقی صفحہ ۸۴ پر)

آٹھویں صدی عیسوی میں جبکہ مسیحی مقتدیانِ مذہب ارشمیدس کی ایجادات، سقراط اور افلاطون کے فلسفہ، ارسطو کی منطق، بطلیموس کے جغرافیہ، اقلیدس کی جیومیٹری اور دیگر تمام تجربی علوم کو شیطانی علوم قرار دیتے ہوئے ان سے عوام کو بچانے کے لئے روما اور اسکندریہ کے تمام بڑے کتب خانوں کو نذرِ آتش کر چکے تھے اور انطاکیہ، قسطنطنیہ اسکندریہ اور روما کے اسقفوں کے جاسوسوں نے اہلِ علم کی جان خطرے میں ڈال رکھی تھی، اس زمانے میں فلسفہ اور تجربی علوم سے بے بہرہ عربوں نے قدیم علم و حکمت کی کتابوں کے نسخے لے کر آنے والے یونانی اہلِ علم کو گلے سے لگایا۔ یونان سے علوم و فنون کی دولت گراں بہا اضافے کے ساتھ اسی راستے سے واپس بغداد پہنچی۔ جس راستے سے قدیم نینوا اور بابل سے یونان میں پہنچی تھی۔ یونانی، قبطی اور سریانی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کا عربی میں ترجمے کا کام بنو امیہ کے دارالخلافہ دمشق میں شروع ہوا اور عباسیوں کے بغداد میں پہلے تو عباسی خلفا کے عہد میں نہ صرف یونانی، قبطی اور سریانی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں بلکہ ایران، ہندوستان اور چین کی بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو گیا۔ مفتوح عراقیوں، یونانیوں، مصریوں اور ایرانیوں کی بلند تہذیب نے فاتح عربوں کو مسخر کر لیا۔ اور عباسی خلیفہ مامون کے عہد تک فلسفہ اور تجربی علوم سے دلچسپی اس قدر بڑھ گئی کہ بغداد میں کتب فروشوں کی سینکڑوں دکانیں کھل گئیں اور علم و ادب اور فلسفہ و حکمت کے مختلف موضوعات پر بحث و تمحیص

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۳) نوابوں کے سرکاٹ کر ان کی کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کئے اور سمرقند کو سب سے بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز بنانے کے لئے سینکڑوں شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کیا اور ان شہروں کے دست کاروں کو گرفتار کر کے سمرقند بھیجا اور آباد کیا۔ (دیکھئے "ہسٹری آف سوویٹ یونین جلد اوّل")

کے لئے درجنوں لٹریری کلبیں اور انجمنیں قائم ہو گئیں، اور یونانی، ہندوستانی، چینی اور ایرانی تصنیفوں پر تبصرے اور مضامین شائع کرنے کے ساتھ ہی ساتھ قدیم علوم میں گراں بہا اضافے کا کام بغداد میں شروع ہوا تھا کہ عباسیوں پر زوال کے بادل چھا گئے جس سے ترقی کے دروازے بند ہو گئے۔ ساتویں عباسی خلیفہ مامون، آٹھویں خلیفہ معتصم باللہ اور نویں خلیفہ واثق باللہ تینوں عقلیت پسند معتزلیوں[1] کے زیر اثر تھے۔ دسویں خلیفہ متوکل باللہ کے خلیفہ بنتے ہی (۸۴۷ء) پانسہ پلٹ گیا۔ معتزلیوں کی جگہ حنبلیوں[2] نے لے لی اور بغداد معتزلیوں، حنبلیوں، اشعریوں[3] اور شیعوں کے مابین بحثوں، مناظروں، جھگڑوں اور فسادوں کا اکھاڑہ بن گیا۔ قدیم یونانی، مصری ہندوستانی اور چینی کتابوں کے ترجمے اور ان کتابوں پر مسلمانوں کے تبصرے نیز عباسیوں کے عہد عروج تک فلسفیوں اور سائنسدانوں کی اپنی معلومات کی کتابیں تہذیب و تمدن کے نئے مرکزوں مثلاً نیشاپور، غزنی، بلخ، بخارا، سمرقند، موصل، قاہرہ

---

[1] فرقۂ معتزلہ کے امام واصل (۷۰۰ء تا ۷۴۸ء) مسلمان فلاسفروں کے سب سے پہلے گروہ یعنی قدریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ امام حسن بصری کے شاگرد تھے اور خدا کی رویت کے قائل نہیں تھے۔ وہ انسان کو اپنے فعل کا مختار سمجھتے تھے اور عقلیت پسند ہونے کے سبب انہوں نے اپنی فقہ کی بنیاد عقل پر رکھی تھی۔

[2] حنبلی فرقہ کے امام احمد بن حنبل امام شافعی کے شاگرد تھے۔ وہ عقل و استدلال کے مخالف تھے اور فقہ کے لئے احادیث پیغمبر اسلام، خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے کردار کی نقل پر زور دیتے تھے۔

[3] فرقۂ اشعریہ کے بانی اوّل امام ابوالحسن اشعری (تاریخ وفات ۹۳۶ء) چونکہ مدت تک معتزلی رہنے کے بعد منقولی گروہ میں شامل ہوئے تھے اس لئے انہوں نے معتزلہ کو جواب دینے کے لئے فلسفیانہ تصورات اور استدلال کی آمیزش کی اور اس طرح اپنے مخالفوں کو شکست دینی شروع کی۔

قرطبہ اور غرناطہ وغیرہ میں پہنچیں۔ اُن کے مقامی زبانوں بالخصوص سلجوقیوں کے عہد میں فارسی میں ترجمے ہوئے اور علم و ادب اور فلسفہ و حکمت کے میدان میں مسلمانوں نے نئے حکمران خاندانوں کی سرپرستی میں تہذیب کے نئے مرکزوں میں ترقی کی۔

مسلمان فلاسفروں میں الکندی[1] صرف عرب تھے۔ فارابی[2] جسے حلب کے ہمدانی بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی، وسط ایشیا کا ترک تھا اور ابن سینا[3] جس نے سامانیوں کی لائبریری سے استفادہ حاصل کیا، بخارا کے قریب ایک گاؤں کا تاجک تھا۔ ابن رشد[4] ہسپانوی عرب تھا اور قرطبہ میں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ علمِ طبابت میں گراں بہا اضافہ کرنے والے رازی (۸۶۴ء تا ۹۳۲ء) طہران اور ابن زہر (۱۰۹۱ء تا ۱۱۶۲ء) اشبیلیہ واقعہ ہسپانیہ کے رہنے والے تھے۔ ریاضی کے ماہر البیرونی (۹۷۳ء تا ۱۰۴۸ء) کو غزنی کے بادشاہوں اور عمر خیام (۱۰۳۸ء تا ۱۱۳۲ء) کو سلجوقی سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیر نظام الملک طوسی کی سرپرستی حاصل تھی۔

قرونِ وسطیٰ کے جاگیرشاہی نظام میں علم و ادب اور سائنس و فلسفہ کی جس قدر ترقی ہو سکتی تھی، وہ تیرھویں اور چودھویں صدی تک اپنے عروج پر پہنچ کر رک گئی۔

---

[1] الکندی ۹ ویں صدی کے وسط میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تو افلاطونیوں کی طرح افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ نظام میں یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش کی اور فیثاغورث کے علم ریاضی کو تمام سائنسوں کی بنیاد قرار دیا۔

[2] فارابی (۸۷۰ء تا ۹۵۰ء) نے افلاطون اور ارسطو کے فلسفے اور تصوف کو سمو کر اپنا نظام مرتب کیا۔

[3] ابن سینا (تاریخ وفات ۱۰۳۷ء) نے یونانی فلسفے بالخصوص غلو کے فلسفہ کا اسلام سے رابطہ قائم کیا۔

[4] ابن رشد (۱۱۲۶ء تا ۱۱۹۸ء) نے ارسطو کے فلسفے کی طرف رجوع کیا تھا۔

ایشیائی ممالک میں نئی پیداواری طاقتوں کی بنیادی کمزوری کا اثر پڑا۔ نہ نئے ادیب سائنسدان اور شاہ کے ظل اللہ ہونے کے نظریہ کے مقابلے میں عوام کی حاکمیت کا نظریہ پیش کرنے والے فلسفی پیدا ہوئے، نہ جاگیرداری اور مطلق العنانی کے خلاف سرمایہ داروں نے سیاسی جماعتوں میں منظم ہوکر انقلابی تحریکوں کی رہنمائی کی اور نہ یورپ کی طرح ایشیا میں جاگیرداری نظام کے بطن سے سرمایہ داری نظام نے جنم لیا۔ چنانچہ ایشیائی ممالک میں ایک کے بعد دوسرا شاہی خاندان اُبھرتا اور چار دن کی عظمت کے بعد کسی دوسرے شاہی خاندان کے اُبھرنے سے صفحہ ہستی سے مٹتا رہا۔ شہر آباد ہوتے اور چند دن کی عظمت کے بعد تاراج اور برباد ہوتے رہے۔ دیہات کا خود کفیل پنچائیتی نظام جُوں کا توُں رہا۔ ٹریڈ گلڈ ترقی نہ کر سکنے کے سبب برادریاں بن گئے۔ تاجروں میں سے فرداً فرداً کسی ایک نے ترقی کی اور میر جملہ کی طرح بادشاہوں، نوابوں، راجوں اور جاگیرداروں کی ریاستوں یا جاگیروں کے ناظم یا دیوان بنے مگر بحیثیت طبقہ تاجر پیشہ لوگ حکمران بننے کی صلاحیت پیدا نہ کر سکے۔

جس طرح شاہی خاندان اُبھرتے اور صفحہ ہستی سے مٹتے رہے، جس طرح شہر آباد ہو کر تاراج اور برباد ہوتے رہے، اسی طرح مذہبی عقائد، سیاسی اور سماجی نظریے اور اخلاقی تصورات کبھی رو بہ عروج اور کبھی زوال پذیر، کبھی صحت مند اور کبھی بیمار ذہنیتوں کی ترجمانی اور عکاسی کرتے رہے۔ مفکر وحدت الشہود[1] (ہمہ از اوست)

---

[1] وحدت الشہود کا نظریہ ہر شاہی خاندان کے اُس دورِ عروج میں مقبول ہوتا تھا جب زوال پذیر شاہی خاندانوں سے طاقت و اختیارات چھین کر نئے حکمران اپنی حکومت قائم کرتے اور دوسرے ملکوں کو فتح کر کے مرکزی حکومت کو مضبوط بناتے اور اپنے وفادار افروں، رشتہ داروں اور قبائلی سرداروں کو جاگیریں عطا کرتے، عہدے دیتے اور صوبائی گورنر مقرر کرتے تھے۔ وحدت الشہود کا نظریہ ان حالات کی صحیح عکاسی اور ترجمانی کرتا تھا۔

اور وحدت الوجود[1] (ہمہ اوست) کے مسئلوں میں الجھے رہے اور دستکاروں اور تاجروں سے تعلق رکھنے والے عالموں اور صوفی منش بزرگوں کی اتحاد، صلح اور زرعی اصلاح کی تحریکوں کا عملی طور پر انجام نئے شاہی خاندانوں کا قیام یا نئے مذہبی فرقوں کی نشوونما یا پیری مریدی کے نئے سلسلوں اور طریقوں کی نشوونما کی صورت میں نکلا۔

برعکس اس کے مغربی یورپ کے نوخیز سرمایہ داروں نے صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے ہسپانیہ کے ابن رشد (ایویروز) کے فلسفہ کوفہ کے رہنے والے ابو موسیٰ جعفر (جیبر) کے الکیمیا، حسن بن ہیثم (الہیزن) اور ابن باجا (ایون پیس) کے علم الہیئت ابن خلدون کے علم تاریخ اور بخارا کے ابن ابی سینا (ابوی سینا) اور سپین کے ابن زُہر (ایون زور) کے علم طب کے لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی میں ترجموں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی بنیادوں پر مزید تحقیق و تفتیش شروع کی۔

مغربی استعمار پرستوں کا غلبہ اور مسلمانوں کے تاثرات

یورپ کے سرمایہ داروں نے صنعت اور تجارت کو ترقی دے کر دیہات کو

---

[1] وحدت الوجود کا تصور اس زمانے میں مقبول ہوتا تھا، جب حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کیلئے بادشاہ پرانے جاگیرداروں سے رابطہ پیدا کر کے اپنی بادشاہت کو مقامی یا قومی بادشاہت بنانے کی کوشش کرتے تھے اور جب حاکم و محکوم کی تہذیبوں کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے سے ایک نئی مشترکہ تہذیب نشوونما پانے لگتی تھی، اتحاد و یکجہتی کے جذبوں کو ابھارنے کے لئے اس زمانے میں وحدت الوجود کا تصور موثر ہتھیار تھا۔ اور جب بغاوتوں، جنگوں اور دشمنوں کے حملوں سے کسی شاہی خاندان پر زوال کے بادل چھا جاتے تھے، تو عالم کی بے ثباتی سے متاثر ہو کر مردہ دل رہبانیت کے جذبوں کو ابھارنے میں تسکین پاتے تھے اور وحدت الوجود کی بنیادوں پر رجحان تصوف کی طرف بڑھتا تھا۔

شہروں کا محتاج اور دست نگر بنایا، جاگیرداروں کی اقتصادی اور سیاسی طاقت کو ختم یا کمزور کر کے جدید سرمایہ داری نظام قائم کیا اور مشرقی ممالک کو مغربی یورپ کا محتاج اور دست نگر بنانے کے لئے راس امید کے گرد جہازرانی شروع کی۔ جس سے مشرقی اور مغربی ممالک کے درمیان تجارت کی اجارہ داری مسلمانوں سے چھن گئی اور ایشیائی ممالک میں قدیم تجارتی راستوں پر آباد صنعتی اور تجارتی شہروں اور ایشیا کی مطلق العنان بادشاہتوں پر انحطاط و زوال کے بادل منڈلانے لگے۔

تجارت پر قبضہ کے ساتھ ہی ساتھ ایشیا پر سیاسی تسلط قائم کرنے کے لئے مغربی یورپ کے سرمایہ داروں نے دغا، فریب، اُمرا کی باہمی مخاصمت، لوٹ مار، عہد شکنی اور مسلح جنگ، غرضیکہ سب ہتھیار استعمال کئے اور مطلق العنان بادشاہتوں کو گرا کر یا کمزور کر کے سب طاقت و اختیارات خود سنبھال لئے اور تجارت کی راہ میں حائل دیہات کے خود کفیل پنچایتی نظام کو توڑنے کے لئے زمین کو جو کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی، افراد کی شخصی ملکیت قرار دے دیا اور پرانی قسم کے ایشیائی جاگیرداری نظام کو ختم کر کے یورپ کے زمینداروں اور جاگیرداروں کی طرح ایشیائی ممالک میں بھی زمینوں کے مالک بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار پیدا کئے اور کاشتکاروں کو جو اب تک آزاد کاشت کار تھے، مزارعوں اور کھیت مزدوروں میں تبدیل کر دیا۔

دغا، فریب، ڈاکہ زنی سے ملتی جلتی تجارت، شاہی خزانوں کی کھلم کھلا لوٹ وغیرہ سے جمع کی ہوئی دولت سے مغربی یورپ بالخصوص انگلستان کے سرمایہ داروں نے دیوہیکل مشینیں ایجاد کر کے صنعتی پیداوار میں انقلاب برپا کیا اور یورپ کے کارخانوں کی بنی ہوئی سستی چیزیں مشرقی ممالک میں فروخت کر کے شہروں کی قدیم صنعت اور

خود کفیل دیہات کی گھریلو صنعت کو تباہ کر دیا۔ غرضیکہ یورپ کے سرمایہ داروں نے
مشرقی ممالک کے زرعی نظام کو تبدیل کیا اور دیہات اور شہروں کی صنعت کو تباہ کر کے
مشرقی ممالک کو مغربی یورپ کا محتاج اور دست نگر بنا دیا۔

مشرق پر مغرب، ایشیا پر یورپ اور مسلمانوں کی حکومتوں پر یورپ کی عیسائی
حکومتوں کی یہ فتح درحقیقت فرسودہ اور بوسیدہ جاگیرداری نظام پر جدید سرمایہ داری
نظام کی فتح تھی۔ انگریزی تسلط سے پہلے ہندوستان میں تقریباً سب کی سب تجارت
ہندو تاجروں کے قبضہ میں تھی۔ مسلمان تاجر صرف گجرات، کاٹھیاواڑ اور بمبئی میں تھے۔
چنانچہ مجموعی طور پر ہندو تاجروں اور گجرات، کاٹھیاواڑ اور بمبئی کے مسلمان تاجروں نے
ہندوستان کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام میں اس تبدیلی کا، جس نے بدنظمی اور
طوائف الملوکی کو ختم کر کے امن قائم کیا تھا، خیر مقدم کیا اور اپنے آپ کو نئے حالات
اور نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالا۔ مگر مراکش سے لے کر انڈونیشیا، ملایا، برما اور
منگولیا تک مجموعی طور پر مسلمان چونکہ قرونِ وسطیٰ کی صنعت، تجارت اور جاگیرداری نظام
یعنی اس اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام سے تعلق رکھتے تھے، جس کے خلاف
اس زمانے میں یورپ کے جدید سرمایہ دار برسرپیکار تھے، اس لئے فرسودہ جاگیرداری
نظام کے خلاف جدید سرمایہ داری نظام کی جنگ کو مسلمانوں نے عیسائیوں کی مسلمانوں
سے دیرینہ عداوت کا مظہر سمجھا اور جاگیرداری نظام کے زوال کو مسلمانوں کا زوال
سمجھتے ہوئے اس زوال کا سبب حقیقی اسلام سے انحراف تصور کیا۔

ان خیالات کا اظہار سب سے پہلے عرب مفکر امام ابن تیمیہ نے کیا۔ آپ
اُس زمانے میں پیدا ہوئے تھے، جب مسلمانوں کی حکومتوں میں عربوں کا اثر و اقتدار

برائے نام بھی نہ رہا تھا۔ امام ابن تیمیہ نے عربوں کے زوال کو مسلمانوں کا زوال سمجھا اور حقیقی اسلام سے انحراف کو اس زوال کا سبب قرار دیتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا کہ غیر اسلامی (مراد غیر عربی) عقائد، رسم و رواج تصورات اور اخلاقی قدروں کو اپنانے سے مسلمان اس اسلام کو چھوڑ چکے ہیں، جو رسالت اور خلافتِ راشدہ کے عہد میں مدینہ میں تھا۔ چنانچہ وہی پہلی عظمت اور عروج حاصل کرنے کے لئے اسلام سے غیر اسلامی عقائد اور تصورات کو خارج کرنا اور خلافت راشدہ کے زمانہ کا نظام ایسا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام ایک مرتبہ پھر قائم کرنا ضروری ہے۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی قیصر و کسرےٰ کے نقشِ قدم پر چلنے کو مسلمانوں کے زوال کا سبب سمجھا اور نہایت ہی صحیح پیش گوئی کی کہ سلطنتِ مغلیہ کے مٹ جانے کے دن قریب ہیں اور اب اسے کوئی طاقت زندہ نہیں رکھ سکتی۔ مگر انہوں نے روہیلوں کو رُوبہ عروج طاقت خیال کرنے میں غلطی کی۔ انہوں نے اس حقیقت کو محسوس نہیں کیا کہ صرف سلطنتِ مغلیہ نہیں، کُل دنیا کا جاگیر شاہی نظام مرض الموت میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اب کوئی طاقت اس نظام کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتی۔ نگاہیں ان کی بھی رسالت اور خلافتِ راشدہ کے نظام کی طرف اٹھیں۔

کُل دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ حاکم اور محکوم قوموں اور طبقوں کے درمیان جد و جہد صرف معیشت اور سیاست کے میدان تک محدود نہیں رہتی، محکوم قومیں اور طبقے حاکموں کی تہذیب، مذہبی عقائد، فلسفیانہ تصورات اور اخلاقی اقدار کے خلاف بھی جد و جہد کرتے ہیں۔ قدیم سلطنت روما کے حکمرانوں کے

خلاف غلاموں، کاشت کاروں اور دست کاروں کی جنگ نے قدیم رومی مذہب کے خلاف عیسائیت کو فروغ دیا۔ کیتھولک کلیسا نے مطلق العنان بادشاہت کی حمایت کی' تو جدید سرمایہ داروں نے پروٹسٹنٹ ازم کو قبول کرتے ہوئے پرانے ادب کے مقابلہ میں نئے ادب کی حوصلہ افزائی کی اور شاہ کے ظل اللہ ہونے کے نظریہ کے خلاف عوام کی حاکمیت کا نظریہ پیش کیا۔

تاریخ عالم اس بات کی بھی شاہد ہے کہ حکمران اگر ایک ترقی یافتہ اقتصادی سیاسی اور سماجی نظام کے نمائندے اور ایک اصلاح یافتہ مذہب کے پیرو ہوں' تو محکوم قومیں اور قبیلے قدیم مذہبی عقائد، فرسودہ رسم و رواج اور دقیانوسی تصورات کو اپناتے ہیں اور انہی کی بنیادوں پر حکمرانوں کے خلاف اپنی جد و جہد کو موثر بنانے کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں مسلمانوں کے تسلط کے خلاف جد و جہد کو موثر بنانے کے لئے ہندو جاگیرداری اصنام پرست رہی اور وحدانیت کی طرف قدم نہیں بڑھایا۔ سپین میں مسلمانوں کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے مقامی جاگیرداروں نے عیسائیت کا جھنڈا بلند کیا۔ آئرلینڈ کے وطن پرستوں نے پروٹسٹنٹ انگریز حکمرانوں کے خلاف جد و جہد میں جو تقریباً چار سو سال جاری رہی، کیتھولک کلیسا کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ خوارج نے جو یمنی ہونے کے سبب حجازی عربوں کے اقتدار کے مخالف تھے' علویوں' امویوں' عباسیوں غرضیکہ تمام بنو قریش کے خلاف جنگ کو موثر بنانے کے لئے رسالت اور پہلے دو خلفائے راشدین کے عہد کے نظام حکومت' قبائلی دور کی سادگی اور مساوات نیز مسندِ خلافت کے لئے قریش اور غیر قریش، عرب اور غیر عرب غرضیکہ ہر مسلمان کے

حق کا پروپیگنڈا کیا اور عربوں کے اقتدار کے خلاف مہذب و متمدن ایرانیوں کی جدوجہد انہیں شیعانِ علی کی صفوں میں لے گئی۔ یہی بات فرسودہ جاگیرشاہی پر جدید سرمایہ داری کی فتح کے موقع پر مسلمانوں میں ہوئی۔ تاجر طبقہ کی غیر موجودگی یا کمزوری کے سبب مسلمانوں نے آگے کی طرف نہیں بلکہ پیچھے کی طرف دیکھا اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جدوجہد کی بنیادیں دورِ گذشتہ کی عظمت کے تصور پر رکھیں۔

مغربی استعمار پرستوں کے خلاف مسلمانوں کی پہلی بغاوتیں

"جہاد فی الاسلام" کے جنگجویانہ نعرے کے ماتحت یورپی حکمرانوں کیخلاف مسلمانوں کی ان پہلی بغاوتوں کے رہنما علماء تھے اور ان بغاوتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں میں ایک تو وہ قبیلے تھے جنہیں نئے حکمرانوں نے ان کی چراگاہوں، زمینوں وغیرہ سے محروم کرنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے وہ دستکار اور تاجر تھے، جنہیں یورپ کے کارخانوں کی تیار شدہ اشیاء تباہ و برباد کر رہی تھیں اور تیسرے وہ کاشتکار تھے جنہیں زمینوں سے محروم کر کے جاگیردار عملی طور پر مزارعہ بنا رہے تھے۔ بڑے بڑے جاگیرداروں، نوابوں، خانوں اور سلطانوں نے عموماً ان بغاوتوں میں نئے حکمرانوں کا ساتھ دیا اور بہت ہی کم ان میں ایسے تھے، جنہوں نے یورپی حکمرانوں کے خلاف اپنے ہم وطنوں یا ہم مذہبوں کا ساتھ دیا ہو۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں دریائے والگا کے مشرق میں آباد مویشی پال کر زندگی بسر کرنے والے باشکیریوں (ترک قبیلوں) کی بغاوت دراصل ان قبیلوں کی بغاوت تھی جنہیں زار کی حکومت ان کی چراگاہوں سے محروم کر کے زمین ردسی

جاگیرداروں کو دے رہی تھی۔ یہ بغاوت مُلّا بطروش کی رہنمائی میں ہوئی جس نے تحفظِ اسلام اور باشکیریوں کی ایک آزاد حکومت قائم کرنے کے لئے زار کی حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور جو چھاپہ مار دستے منظم کر کے روسی فوجوں کے خلاف دو سال تک جنگ کرنے کے بعد گرفتار ہوا اور سینٹ پیٹرز برگ (اب لینن گراڈ) کے جیل خانے سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک سپاہی کی بندوق کی گولی کا نشانہ بنا۔

شمالی اور شمال مغربی قفقاز کے ایک پہاڑی خطہ داغستان پر ۱۸۲۸ء میں قبضہ کرنے کے بعد جب زار کی حکومت نے کاشتکاروں پر ٹیکس کے بوجھ کو کئی گنا بڑھا دیا تو مُلّا کاظم نے اسلام کے نام پر جہاد کا اعلان کیا اور داغستانی کاشتکاروں نے جو ترک تھے، مُلّا کاظم کے مرید مُلّا اسماعیل کی سرکردگی میں مسلح بغاوت کر کے ۱۸۳۴ء میں اپنی حکومت قائم کر لی اور زار روس کی طاقت کے ساتھ ہی ساتھ داغستانی جاگیرداروں، خانوں اور بیگموں کی طاقت کو بھی ختم کر دیا۔ زار کی فوجوں نے یکے بعد دیگرے کئی حملے کئے مگر مسلح پہاڑی کاشتکاروں کو شکست دینے میں ناکام رہیں۔ جدوجہد مُلّا اسماعیل کی گرفتاری (۱۸۵۹ء) کے بعد مُلّا کاظم کے ایک دوسرے مرید مُلّا امین کی سرکردگی میں جاری رہی۔ زار کی فوجوں نے بڑے بڑے ظلم کیئے۔ چار لاکھ کاشتکار اپنے مویشی فروخت کر کے کشتیوں پر سوار ہوئے اور ترکی چلے گئے، مگر شکست اور اطاعت قبول نہیں کی۔

وسط ایشیا پر زار کے مکمل تسلّط کے فوراً ہی بعد ۱۸۷۰ء میں سمرقند اور ۱۸۷۵ء میں توقند کے تاجروں اور دستکاروں نے منظم ہو کر مسلح بغاوت کی اور روسی فوجوں کو شکست دی۔ یہ بغاوتیں جو روسی فوجوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں دبا دیں، مُلّا عبدالرحمان آفتابچی کی رہنمائی میں ہوئیں جس نے "کافر روسیوں" کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تھا۔ ۱۸۹۸ء

میں اندیجان (فرغانہ) کے علاقہ میں آباد اُزبک اور کرغی کاشتکاروں نے بغاوت کی - یہ کاشت کار پہلے آزاد تھے ، مگر روسی تسلط کے بعد اُزبک اور روسی جاگیرداروں کے مزارعہ بنا دیئے گئے تھے - یہ بغاوت جو مُلا محمد علی کی رہنمائی میں ہوئی ، روسی فوجوں نے بڑی سختی سے دبا دی - بغاوت کے اکیس رہنماؤں کو جن میں ملا محمد علی بھی تھے ، پھانسی کی سزا ملی اور اس بغاوت میں حصہ لینے والے تین سو اڑتالیس اُزبک اور کرغی کاشتکاروں کو عمر قید کی سزا دی گئی - اسی نوعیت کی بغاوتیں کازخستان اور آذربائیجان میں بھی روسی تسلط کے بعد ہوئیں ، جنہیں روسی فوجوں نے دبا دیا -

امام ابن تیمیہ کے خیالات اور تصورات کی بنیادوں پر وہابیوں کے امام عبدالوہاب نے اٹھارھویں صدی میں وہابی تحریک شروع کی اور انیسویں صدی کے شروع میں اس تحریک کے رہنما ابنِ سعود کی سرکردگی میں عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے حجاز پر قبضہ کر لیا - اس بغاوت کا مقصد جسے مصر کے محمد علی پاشا نے دبا دیا ، ترکوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا تھا - کم و بیش یہی کیفیت شمالی افریقہ میں شیخ سنیوسی کی تحریک کی تھی -

انیسویں صدی کے آغاز میں بنگال کے مولوی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک دراصل جدید ہندوستان میں پہلی کسان تحریک تھی - یہ ان مسلمان بنگالی کسانوں کی تحریک تھی جنہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اور اس کے ملازموں کی عریاں ، حیا سوز اور براہ راست لوٹ کھسوٹ اور بنگال کے دوامی بندوبست کے پیدا کردہ نئے جاگیرداروں اور زمینداروں کے وحشیانہ استحصال نے تباہ و برباد کر دیا تھا - مولوی شریعت اللہ کے بعد دُدھو میاں کی سرکردگی میں اس تحریک نے ۱۸۲۸ء میں بنگال کے کئی اضلاع میں

کھلم کھلا بغاوت کی شکل اختیار کی، جسے دبانے کے لئے انگریزی فوج کے دو تین سال صرف ہوئے۔

سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کی سرکردگی میں بنگال اور بہار سے ۱۸۲۴ء میں پیدل سفر کرکے بہاولپور ہو کر درہ بولان سے افغانستان اور پھر درہ خیبر سے گذر کر سرحدی پٹھانوں کو سکھوں کے خلاف جہاد کے لئے ابھارنے اور پشاور پر قبضہ کر کے ۱۸۳۰ء میں شرعی حکومت قائم کرنے والوں میں بنگالی کسانوں کے علاوہ بنگال اور بہار کے دستکار بھی تھے، جن کی صنعت کو انگلستان کے کارخانوں کی تیار شدہ چیزوں نے برباد کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ حکومت پٹھانوں کے مخالفت میں اُٹھ کھڑے ہونے سے ایک سال بھی قائم نہ رہی اور شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید ضلع ہزارہ میں بالاکوٹ پر رنجیت سنگھ کی سکھ فوجوں سے لڑتے لڑتے مئی ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔

سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے بعد پٹنہ کے محلہ صادق پور کے مولانا ولایت علی اور عنایت علی کی تحریک بھی جو وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہے، دستکاروں کی تحریک تھی۔ قدیم صنعت کی تباہی سے وہ دستکار جو دیہات سے ناطہ رکھتے تھے شہروں کو چھوڑ کر دیہات کو جا رہے تھے اور جو دستکار دیہات سے تعلق توڑ چکے تھے، وہ شہروں میں بے روزگاروں کی تعداد بڑھا رہے تھے۔ چنانچہ بے چینی پھیل رہی تھی اور نئے حکمرانوں کے خلاف نفرت بڑھ رہی تھی۔ صادقپوری علمائے بنگال سے پشاور تک ہر چھوٹے بڑے قصبے اور شہر میں دستکاروں کو منظم کرکے وہابی تحریک کے خفیہ مرکز قائم کئے اور سرحدی پٹھانوں سے متحدہ محاذ بنا کر ۱۸۶۶ء تک پہلے سکھوں اور

بعد میں انگریزوں کے خلاف کئی مرتبہ مسلح جنگ کی۔

غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف "دارالحرب" اور "دارالاسلام" کے نظریوں اور "فرنگی حکومت سے نفرت اور اس کی "ملحدانہ" تعلیم کے مقاطعہ کی بنیادوں پر علما کی سرکردگی میں کاشتکاروں، دستکاروں وغیرہ کی یہ پرانی طرز کی انتہاپسند تحریکیں اور مسلح بغاوتیں ناکام ہوئیں اور ایک طرف حکومت کے تشدد اور دوسری طرف حالات میں تبدیلی سے رفتہ رفتہ مذہبی فرقوں میں تبدیل ہو گئیں۔

جمہوری آزادی کے لئے جدوجہد

مغربی یورپ کے سرمایہ داروں نے مقبوضہ ایشیائی ممالک میں اپنے کارخانوں کے لئے کچا مال حاصل کرنے اور ان کارخانوں کی تیار شدہ اشیاء کو فروخت کرنے کے لئے دیہات کے خودکفیل پنچایتی نظام کو درہم برہم کیا۔ زمین کو افراد کی شخصی ملکیت اور خرید و فروخت کی شے بنایا۔ شہروں کی صنعت اور خودکفیل دیہات کی گھریلو صنعت کو تباہ کیا۔ جدید صنعت کو ترقی کرنے سے روکا اور وطن پرستی کے جذبہ کو سختی سے دبایا۔ انہوں نے کاشتکاروں کو اپنی زمینوں اور دستکاروں کو اپنے اوزاروں اور ورکشاپوں سے محروم کر کے مزدور بننے کے لئے مجبور کر دیا۔ مگر جدید صنعت کو ترقی کرنے سے روک کر شہروں میں ان کے لئے روزگار پیدا کرنے سے گریز کیا۔ انہوں نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے دیسی تاجروں کو کمیشن ایجنٹ بن کر روپیہ کمانے کی اجازت دی۔ مگر جب ان کے پاس روپیہ جمع ہو گیا تو اسے کارخانوں اور کانوں میں لگانے سے روکا۔ انہوں نے سرکاری

دفاتر میں کم سے کم تنخواہ پر کام کرنے والے کلرک پیدا کرنے کے لئے نوجوانوں کو
جدید علوم کی تعلیم دی۔ مگر روسیو، والٹیر، کابڈن اور ملز کے جدید جمہوری نظریوں
کے مطابق مقبوضہ ممالک میں عوام کی نمائندہ حکومت قائم کرنے کی تمام کوششوں
کو سختی سے دبایا۔ غرضیکہ غیر ملکی سرمایہ داروں نے مقبوضہ ایشیائی ممالک میں پرانے
نظام کو درہم برہم کر کے سماج کو سرمایہ داری نظام کے سانچے میں ڈھالا مگر اس نظام
کو اپنے لاؤ لشکر سمیت زندگی کے ہر شعبہ پر مسلط ہونے سے روکا اور محکوم ملکوں میں
اپنے اس نو آبادیاتی نظام کو مضبوط و مستحکم رکھنے کے لئے جاگیر دار اور بڑے زمیندار
پیدا کئے اور نوابوں، راجوں، بیگموں، سلطانوں وغیرہ کی سیاسی و فوجی طاقت کو کمزور
یا ختم کر کے ان سب کو اپنی حکومت کے ستون کی حیثیت سے مصنوعی طور پر
قائم رکھا۔ چنانچہ ان محکوم ایشیائی ممالک میں جس طرح دورِ قدیم کے اوزاروں، ہتھیاروں
اور نقل و حمل کے وسیلوں کے پہلو بہ پہلو دورِ جدید کے اوزار، ہتھیار اور نقل و حمل
کے وسیلے رواج پائے، اسی طرح دورِ قدیم سے اب تک تمام تاریخی ادوار کی نمائندگی
کرنے والے خیالات عقائد، رسم و رواج سیاسی نظریات اور اخلاقی اقدار موجود ہیں۔

غیر ملکی حکومت کے ستون جاگیرداروں، تعلقہ داروں، بڑے زمین داروں اور
نوابوں کے فرزند جدید تعلیم حاصل کر کے سامراجی نظام کو سب سے بہتر نظام اور سامراجی
حکومت کو سب سے بہتر حکومت قرار دے کر مغربی تہذیب کے پرستار بن گئے۔ برعکس
اس کے سامراجیوں کے قائم کردہ نظام میں محکوم ملکوں کے دستکاروں اور درمیانہ
درجہ کے مالک کاشت کاروں کا چونکہ ہر قدم تنزل اور اقتصادی دماغی بربادی
کی طرف تھا، اس لئے پرانی طرز کی انتہا پسند تحریکوں اور بغاوتوں کی ناکامی کے بعد

بھی ایک طویل عرصہ تک گذشتہ عظمت کا تصور مسلمانوں کے سامراج دشمن جذبوں کو اُبھارتا رہا۔

قدیم اور جدید نظریات کے پہلے آپس میں تصادم، پھر ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے اور اس کے بعد ایک دوسرے کی طرف بڑھنے سے بیسویں صدی کے آغاز میں ایک نئی تحریک کی ابتدا ہوئی۔ اس تحریک نے نئے طرز کی جمہوری آزادی کو عین اسلام حتیٰ کہ ترکی میں ۱۹۰۹ء کے دستوری انقلاب کو "امرہم شوریٰ بینہم" کی سچی تعبیر قرار دیا۔ ہندوستان میں اس تحریک کے رہنما علامہ شبلی، مولانا محمود الحسن، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ تھے، جنہوں نے اپنی تصانیف اور مضامین میں اسلام کے جمہوری اصولوں کو اُبھارا اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف آزادی کی ان تحریکوں کی رہنمائی کی جو بلقان ایجی ٹیشن، خدام کعبہ اور خلافت کے نام سے مشہور ہیں۔ ان تحریکوں کا ایک بڑا مقصد مرض الموت میں مبتلا سلطنت ترکی کو بچانا تھا، جسے روس میں بالشویک انقلاب سے پہلے زارِ روس، جرمنی، برطانیہ اور فرانس اور پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس آپس میں بانٹ کر صفحۂ ہستی سے مٹا رہے تھے۔ ان تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ شہروں کے دستکاروں اور چھوٹے چھوٹے تاجروں اور ان کے بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں نے لیا۔ جاگیردار، بڑے زمیندار اور اونچے تاجر نہ صرف ان تحریکوں کے مخالف تھے، بلکہ انہوں نے ان تحریکوں کو دبانے میں حکومت کی امداد کی۔

مطالبۂ پاکستان کا پس منظر

ہندوستان میں مسلمانوں نے تجارت کے میدان میں قدم اس وقت رکھا جب غیر مسلم بالخصوص ہندو تاجر بڑے بڑے کارخانوں، تجارتی فرموں، انشورنس کمپنیوں اور

بنکوں کے مالک یا ڈائریکٹر بن چکے تھے۔ چنانچہ قلیل سرمایہ اور ناتجربہ کاری کے سبب مسلمان تاجر اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں ایک مخصوص منڈی درکار تھی جس میں نہ صرف ان کا سرمایہ محفوظ ہو بلکہ دن دُگنا اور رات چوگنا بڑھے۔ اسی طرح مسلمان نوجوان جدید تعلیم حاصل کر کے سرکاری دفاتر کے دروازوں پر پہنچے، تو نہ صرف خالی آسامیاں محدود تھیں بلکہ ملازم ہونے اور ترقی کرنے کے لئے انہیں مقابلہ ان سے کرنا پڑا جو زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ تجربہ کار تھے۔ انہیں ایسا ملک چاہئے تھا جہاں سرکاری ملازمتیں صرف ان کے لئے مخصوص ہوں۔ یہی حال وکیلوں اور ڈاکٹروں وغیرہ کا تھا۔

۱۹۱۹ء کی دستوری اصلاحات اور ۲۱-۱۹۲۰ء کی خلافت اور کانگرس کی تحریکوں نے جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کو اپنے حقوق و مراعات نیز سامراجی مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے اسمبلی پارٹیاں بنانے کے لئے مجبور کیا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخاب میں کانگرس کی کامیابی سے گیارہ صوبوں میں سے نو صوبوں کی وزارتیں جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے قبضہ سے نکل گئیں اور سارے ہندوستان میں کسانوں اور مزارعوں نے منظم ہو کر جاگیرداری اور بڑی زمینداری کی تنسیخ کا مطالبہ کیا۔ ان حالات کے زیر اثر مسلمان جاگیردار اور بڑے زمیندار ایک ایسے وطن کی ضرورت محسوس کرنے لگے، جس میں حکومت ان کی اپنی ہو اور جس میں جاگیرداری اور بڑی زمینداری کی تنسیخ کا کوئی خدشہ نہ ہو۔

چنانچہ تاجروں، سرکاری اور غیر سرکاری ملازموں، وکیلوں، ڈاکٹروں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی حمایت اور شمولیت سے مضبوط و مستحکم ہو کر مسلم لیگ نے اپریل ۱۹۴۰ء میں پاکستان کا مطالبہ کیا اور اس مطالبہ کی حمایت میں مسلمانوں کو متحد

کرنے کے لئے مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے مذہبی سیاسی اور تہذیبی رہنماؤں نے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گی، ایک ہی سانس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی سادگی، مساوات، اخوت، جمہوریت پسندی اور اخلاقِ حسنہ کا ذکر کیا۔ اموی اور عباسی خلفاء اور دوسرے بادشاہوں کے جاہ و جلال، شان و شوکت اور رعب داب کی تعریفیں کیں اور مخالفوں کو ڈرانے کے لئے دھمکیاں چنگیز اور ہلاکو بننے کی دیں۔ مسلم عوام موجودہ حالات سے بے زار تھے اور آزادی چاہتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے مطالبہ کو اپنی آزادی کا مطالبہ سمجھا اور مسلم لیگ کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی چین، ویٹ نام، انڈونیشا، ملایا، ہندوستان ایران غرضیکہ تمام محکوم ایشیائی ممالک میں عوامی آزادی کی تحریکوں کا دور شروع ہوا۔ انگریز سامراجی اقتصادی سیاسی اور فوجی اعتبار سے کمزور ہو چکے تھے۔ ان کے لئے ہندوستان میں اپنی براہ راست حکمرانی قائم رکھنا مشکل اور ناممکن ہو گیا تھا۔ چنانچہ عوامی تحریکوں کو دبانے اور اپنے اقتصادی سیاسی اور فوجی اقتدار کو بدستور قائم رکھنے کے لئے انہوں نے کانگرس کے چند بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور مسلم لیگ کے چند بڑے تاجروں اور جاگیرداروں سے سمجھوتہ کر کے ملک کو ہندوستان اور پاکستان دو ملکوں میں اس طریقہ سے تقسیم کیا کہ دونوں ملک اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے کمزور رہ گئے۔ انہوں نے دونوں ملکوں میں ایسے تجارتی اور سیاسی جھگڑے پیدا کر دیئے کہ دونوں انگریزوں کے محتاج اور دست نگر رہیں اور ان میں کوئی بھی سلطنتِ برطانیہ سے اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے آزاد ہونے کی جرأت نہ کرے۔

اسلامی ریاست کے مطالبہ کی بنا پر پاکستان کے نام سے جو ریاست وجود میں آئی ہے، وہ پاکستانی عوام کی آزاد اور خود مختار ریاست نہیں بلکہ انگریز سامراجیوں کی ایک محکوم ریاست ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے انگریز حکومت کرتے صاف دکھائی دیتے تھے۔ اب پردوں کے پیچھے بیٹھے ملک کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی پالیسی کی رہنمائی کر رہے ہیں اور وزارت کی کرسیوں پر ان جاگیرداروں اور بڑے تاجروں کے نمائندے بیٹھے ہیں، جنہیں انگریز سامراجیوں نے پالا پوسا اور خصوصی مراعات کے انجکشنوں سے زندہ رکھا ہے۔

اس ریاست میں جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کو کامل آزادی ہے۔ جس قدر چاہیں مزارعوں اور غریب کسانوں کا خون چوس سکتے ہیں۔ اس ریاست میں بڑے تاجروں کے چند خاندانوں کو غیر ملکوں سے مال درآمد کر کے من مانی قیمتوں پر فروخت کرنے اور چار پانچ گنا زیادہ نفع حاصل کرنے کی کامل آزادی ہے۔ اس ریاست میں بڑے سرکاری افسر اپنی قابلیت کی بنا پر جن کرسیوں پر کبھی بیٹھ نہیں سکتے تھے، اب بیٹھے ہیں اور ان کی تنخواہیں پہلے سے دوگنی ہو گئی ہیں۔ جہاں تک مزدوروں کسانوں، دستکاروں اور درمیانہ اور نچلے درجے کے تاجروں اور کلرکوں کا تعلق ہے، ان کا معیارِ زندگی لگاتار گرتا رہا۔

مسلم لیگ اور جماعت اسلامی

مسلم لیگی علماء پاکستان کی موجودہ ریاست کو اسلامی ریاست اور "وامرھم شوریٰ بینھم" کی صحیح تعبیر قرار دیتے ہیں اور جب سے پاکستان کی مجلس دستور ساز

نے ایک قرارداد پاس کر کے پاکستان میں "خدا کی حاکمیت" کا اعلان کیا ہے، مولانا مودودی کی جماعتِ اسلامی بھی جو اُسے "لادینی" اور "غیر اسلامی" ریاست سمجھتی تھی، اب "اسلامی ریاست" قرار دیتی ہے۔ اعتراض صرف پاکستان کی موجودہ حکومت پر ہے۔ اسے وہ اب بھی "غیر اسلامی" حکومت سمجھتی ہے۔

ریاست جس سے مراد نظامِ حکومت ہے نہ مقدس ہے اور نہ ہمیشہ سے قائم ہے۔ اس کی نشوونما سماج کے طبقوں میں بٹ جانے سے ہوئی تھی اور سماج میں طبقوں کی تقسیم مٹتے ہی حکومت مفقود ہو جائے گی۔

ریاست، جو سماج کی مختلف طبقوں میں تقسیم سے وجود میں آئی تھی برسرِ اقتدار طبقے کے ہاتھ میں ہمیشہ دوسرے طبقوں کو دبانے کا ہتھیار رہی ہے۔ ریاست اور حکومت میں کوئی فرق اور کوئی تضاد نہیں۔ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں ریاست نظری اور تصوری پہلو ہے اور حکومت ظاہری اور عملی پہلو۔ جیسی ریاست ہوگی ویسی ہی حکومت ہوگی۔ جب سے ریاست وجود میں آئی ہے، یہی ہوا ہے۔

غلامی کے دور میں ریاست خواہ اس کی شکل شہری ریاست تھی، سپہ سالاروں کی آمریت یا مطلق العنان بادشاہت، غلاموں کو دباتے کے لئے غلام داروں کے ہاتھ میں طبقاتی ہتھیار تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں ریاست ہر ملک میں جاگیرداروں کی ریاست تھی —— اور شاہی دربار ان کے مفاد کی حفاظت کرتے تھے، اور کاشتکاروں اور تاجروں کو دباتے تھے۔ سرمایہ داری کے دور میں ریاست خواہ جمہوری ہے، فاشسٹ یا محدود آئینی بادشاہت اور خواہ برسرِ اقتدار پارٹی کنزرویٹو ہے، لبرل یا لیبر، سرمایہ دار طبقے کے مفاد و حقوق کی حفاظت کرتی اور محنت کش طبقوں کو دباتی ہے۔ سوویٹ

یونین میں بھی سوویٹ ریاست اور حکومت ایک طبقاتی ہتھیار ہے۔ وہ محنت کش طبقوں کے مفاد و حقوق کی حفاظت کرتی اور ان کے مخالف طبقوں کو دباتی ہے۔

ہندوستان میں تقسیم سے پہلے حکومت انگریز سرمایہ داروں کی تھی اور وہ اپنے پیدا کردہ جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی مدد سے اس ملک کی زرعی، صنعتی، سیاسی اور تہذیبی ترقی کو روکتے اور مزدوروں، کسانوں، درمیانہ طبقوں اور چھوٹے چھوٹے تاجروں کو دباتے تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں تبدیلی صرف یہ ہوئی ہے کہ حکمران طبقہ انگریز اور امریکی سامراجیوں کے دست نگر اور محتاج بڑے تاجروں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں پر مشتمل ہے اور جہاں تک اس ملک کی ریاست کا تعلق ہے، وہ بدستور انگریز اور امریکی سامراجیوں کی محکوم اور دست نگر نیم سرمایہ داری اور نیم جاگیرداری ریاست ہے۔ مولانا مودودی کو مسلم لیگی علماء سے اتفاق ہے کہ پاکستان کی موجودہ نیم سرمایہ داری اور جاگیرداری ریاست، جس میں معدودے چند جاگیرداروں، زمینداروں اور بڑے تاجروں کے علاوہ باقی سب کی حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے، اسلامی ریاست ہے۔

اگر قرارداد مقاصد میں "خدا کی حاکمیت" کا محض اعلان کر دینے سے انگریز اور امریکی سامراجیوں کی ایک محکوم ریاست "لادینی ریاست" سے "اسلامی ریاست" میں تبدیل ہو سکتی ہے تو جماعت اسلامی کے علماء بنو امیہ سے لے کر اب تک مسلمانوں کی تمام ریاستوں کو "غیر اسلامی حکومتیں" کیوں قرار دیتے ہیں، جبکہ سب شاہی خاندان "خدا کی حاکمیت" کو مانتے ہوئے اپنے آپ کو رسول اللہ صلعم کا خلیفہ کہتے تھے؟

درحقیقت جماعت اسلامی کے مولوی بھی جاگیرداروں، زمینداروں اور بڑے تاجروں کے مفاد و حقوق کی حفاظت کرتے ہیں۔ پاکستان کی موجودہ ریاست کو "اسلامی

ریاست" قرار دینے کا اصل سبب یہی ہے۔ مسلم لیگ سے ان کے اختلاف کی خاصیت وہی ہے، جو امریکہ کی ڈیموکریٹک پارٹی اور ری پبلکن پارٹی یا برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی لبرل پارٹی اور لیبر پارٹی کے درمیان اختلاف کی ہے۔ حکومت سے مولانا مودودی کی مراد وزارت ہے۔ مسلم لیگی وزارت کی جگہ اگر جماعت اسلامی کے "صالحین" کی وزارت قائم ہو جائے، تو مولانا مودودی کا نظریہ بدل جائے گا۔ وہ اس "غیر اسلامی" حکومت کو "اسلامی" حکومت کہنے لگیں گے۔

جاگیرداری اور سرمایہ داری دونوں پر زوال کے بادل چھلٹے ہوئے ہیں اور جماعت اسلامی اسلام کے سیاسی نظام کے نام سے جس سیاسی نظام کا خاکہ پیش کرتی ہے، وہ کوئی دوسرا نظام نہیں، وہی نظام ہے جو جاگیردار اور سرمایہ دار اپنے تنزل کے دور میں قائم کرتے ہیں۔

جدید سرمایہ دار اپنے ابتدائی ادوار بالخصوص مطلق العنان بادشاہت کے خلاف جدوجہد کے دوران میں عوام کی حاکمیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کے اداروں، مثلاً سیاسی پارٹیوں، کونسلوں، اسمبلیوں، پارلیمنٹوں اور ان کے انتخاب کے اداروں کو وجود میں لاتے اور انہیں مضبوط بناتے ہیں مگر جب ہی سرمایہ داری نظام اپنے زوال و انحطاط کے دور میں داخل ہوتا ہے اور اقتصادی بحران ایک مستقل اور دائمی صورت اختیار کر لیتا ہے، عوام میں بے چینی بڑھتی ہے اور مزدور اور کسان فرسودہ نظام کو درہم برہم کر کے نیا نظام قائم کرنے کے لئے انقلابی جدوجہد شروع کر دیتے ہیں اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ادارے عوامی بے چینی اور جدوجہد کو دبانے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں تو دولتمند حکمران طبقے شہری آزادی،

جمہوریت، اخوت اور مساوات کے بلند دعوے چھوڑ کر فاشزم یعنی زردار طبقوں کی برہنہ اور بزورِ شمشیر حکمرانی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ مزدور اور کسان جنھہ بندیوں سیاسی پارٹیوں، اسمبلیوں کونسلوں اور پارلیمنٹوں کو توڑ دیتے ہیں۔ ایک ملک، ایک قوم، ایک پارٹی اور ایک رہنما کے نعرے بلند کرتے ہیں اور آمریت قائم کر دیتے ہیں۔ پہلے وزیر پارلیمنٹیں، اسمبلیاں اور سیاسی پارٹیاں "عوام" کو جوابدہ تھیں، اب عوام آمر اور اس کی قائم کردہ حکومت کو جوابدہ بنا دیئے جاتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اٹلی میں مسولینی کی فاشسٹ پارٹی اور ۱۹۳۲ء کے بعد جرمنی میں ہٹلر کی نازی پارٹی نے انہی اصولوں پر اپنی حکومتیں قائم کی تھیں۔

جماعت اسلامی کی اسلامی حکومت

مولانا مودودی اپنی تصانیف[1] میں اسلام کے سیاسی نظام کے نام سے جس سیاسی نظام کا دھندلا سا خاکہ پیش کرتے ہیں، وہ اٹلی کی فاشسٹ حکومت اور جرمنی کی نازی حکومت کا چربہ ہے۔ جماعت اسلامی کی قائم کردہ "اسلامی" حکومت میں نظری طور پر حاکمیت خدا کی ہوگی اور نظم و نسق کی ذمہ داری ایک امیر کے سپرد ہوگی۔ امیر اور اس کی مجلسِ شوریٰ کے انتخاب میں ہر بالغ کو نہیں بلکہ ان "صالح" بالغ مردوں اور عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ہوگا، جو اسلامی دستور سے نہ صرف متفق ہوں گے بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے اور اس کی تفصیلات سے پوری طرح واقف ہوں گے۔ اس ریاست میں قانون بنانے کا اختیار کسی کو نہیں ہوگا۔ جماعت اسلامی کا

---

[1] مثلاً "اسلام کا نظامِ حیات" اور "اسلام کا نظریہ سیاسی"۔

نظریہ ہے کہ خدا کا بنایا ہوا قانون قرآن میں موجود ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اس قانون کی تشریح اور وضاحت صرف وہی اشخاص کر سکتے ہیں، جو قرآن و احادیث کے علم پر عبور رکھتے ہیں۔ مجلسِ شوریٰ کے علما ممبروں پر مشتمل ایک سب کمیٹی قرآن و حدیث کی روشنی میں قانونِ الٰہی کے نفاذ کی نگرانی کرے گی اور امیر کو جسے مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کے مشورے کو رد کرنے کا حق ہوگا، خدا کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے صرف انہی اختیارات کو استعمال کرنے کا مجاز ہوگا جو قرآن و احادیث کی روشنی میں حاکمِ اعلیٰ یعنی خدا کی طرف سے اُسے تفویض ہیں۔

غرضیکہ "اسلامی حکومت" اور "خدا کی حاکمیت" کے نعروں سے مسلمانوں کو مسحور کر کے جماعت اسلامی پاکستان میں ایک ایسی فاشسٹ حکومت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہے، جس میں عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے حکومت کرنے اور اپنی اقتصادی سیاسی سماجی اور تہذیبی ترقی کے لئے قانون بنانے کے حق سے محروم ہوں گے، جس میں عوامی جمہوریت کا نام و نشان تک نہ ہوگا، جس میں ایک شخص کی آمریت ہوگی اور قانون بنانے کے سب اختیارات مولویوں کی ایک فاشسٹ گرانڈ کونسل کو حاصل ہوں گے۔ اس فاشسٹ نظامِ حکومت میں جاگیرداری کو منسوخ کرنے کلیدی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے اور جاگیرداروں کی وحشیانہ لُوٹ کھسوٹ اور بڑے تاجروں کی حیا سوز نفع خوری پر پابندی لگانے کے لئے آواز بلند کرنا کفر کے مترادف ہوگا۔ جماعت اسلامی جس اسلامی حکومت کے لئے جدوجہد کر رہی ہے اس کے خدوخال یہی ہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا نعرہ ایک بار نہیں، کئی بار لگ چکا ہے۔ بنو عباس نے بنو امیہ کو گرانے کے

لئے اسلامی حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا مگر تاج و تخت حاصل کرنے کے بعد جو حکومت قائم کی وہ بنیادی طور پر بنو امیہ کی حکومت سے مختلف نہ تھی۔ اسی طرح فاطمیوں نے بنو عباس کا تختہ الٹنے کے لئے شمالی افریقہ کے بربر قبیلوں سے اسلامی حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا مگر طاقت حاصل کرنے کے بعد جو حکومت قائم کی، اس کا ڈھانچہ بنو عباس کی حکومت سے مختلف نہیں تھا۔ ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی میں مسلمانوں نے انگریزوں، فرانسیسی اور ڈچ حکمرانوں کے خلاف اسلام کے نام پر بغاوتیں کیں اور جہاں کہیں تھوڑے عرصہ کے لئے کامیابی ہوئی، بغاوت کے رہنماؤں نے اسی قسم کی حکومت قائم کی جس قسم کی "فرنگی" حکمرانوں کے تسلط سے پہلے تھی۔ ہماری اپنی آنکھوں کے سامنے مسلم لیگی جاگیرداروں، زمینداروں اور بڑے تاجروں نے اسلامی حکومت قائم کرنے کا پروپیگنڈا کیا، مگر پاکستان بننے کے بعد اسی نیم سرمایہ داری اور نیم جاگیرداری محکوم نظامِ حکومت کو "اسلامی نظامِ حکومت" کہہ کر پیش کیا، جسے انگریز سامراجیوں نے قائم کیا تھا۔

انگریز اور امریکی سامراجیوں کے محکوم اور دست نگر پاکستان کے موجودہ نظامِ حکومت میں عوام کا ایک بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ گھریلو صنعت اور چھوٹی چھوٹی کارخانہ داری تباہ ہو رہی ہے۔ چھوٹے اور درمیانہ تاجر دیوالیہ ہو رہے ہیں۔ بے روزگاری اور مفلسی بڑھ رہی ہے اور عوام میں بے چینی پھیل رہی ہے۔ چنانچہ حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں اور موجودہ حالات کو بدلنے کے لئے مزدور، کسان، تاجر، دستکار، ملازم اور بے روزگار منظم ہو رہے ہیں۔ جد و جہد کر رہے ہیں۔ جس طرح پہلی جنگ عظیم کے بعد اقتصادی بدحالی کے دور میں اٹلی کی فاشسٹ پارٹی نے ایک طرف ایک ہی سانس میں جاگیرداری، سرمایہ داری اور کمیونزم کی مذمت کرتے ہوئے اور دوسری طرف

قدیم سلطنتِ روما کی عظمت کے ذکر سے قومی جذبات کو اُبھارتے ہوئے تباہ حال تاجروں اور بے روزگار فوجی سپاہیوں کی مدد سے طاقت حاصل کی تھی، جس طرح ۱۹۲۹-۳۳ء کی اقتصادی بدحالی کے دَور میں جرمنی کی نازی پارٹی نے سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں کی مذمت کرتے ہوئے نیشنل سوشلزم کو ان دونوں کے درمیان ایک تیسری راہ کی حیثیت سے پیش کر کے تباہ حال تاجروں اور پڑھے لکھے بےروزگاروں کی حمایت سے طاقت پر قبضہ کیا تھا، اسی طرح آج پاکستان میں جماعت اسلامی چھوٹے اور درمیانہ درجہ کے تاجروں، دست کاروں، امیر کسانوں، سرکاری ملازموں اور پڑھے لکھے بے روزگاروں کے سامنے سرمایہ داری اور کمیونزم کی مذمت کرتے ہوئے "اسلامی نظام حکومت" کو "متوسط راہ" کے طور پر پیش کرتی ہے۔ جس طرح اٹلی میں فاشسٹ پارٹی اور جرمنی میں نازی پارٹی کی "متوسط راہ" تنزل کے دَور میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کو بزورِ تشدد قائم رکھنے کی راہ ہے اسی طرح جماعت اسلامی فاشسٹ نظامِ حکومت قائم کرنے کی راہ ہے۔

جس طرح عیسائی درویشوں نے "زمانۂ کفر" کے قدیم یونانیوں کی کلاسیکی تصنیفوں سے حرف بحرف نقل کر کے کیتھولک اولیا کے لغو سوانح لکھے تھے جس طرح الکندی، الفارابی، ابن سینا اور ابنِ رُشد نے یونانی فلاسفروں بالخصوص افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کو اسلامی عقائد کی تائید میں پیش کیا تھا، جس طرح ۹ ویں صدی کے مشہور صوفی[1] بزرگ بایزید بسطامی نے بدھ مت کے عقیدہ نروان سے متاثر ہو کر "فنا" کے

---

[1] مسلمان زاہدوں نے ساتویں اور آٹھویں صدی میں جب عیسائی راہبوں کی طرح اپنے جسم کو اُونی کمبل یا گدڑی سے ڈھانپنا شروع کیا تو وہ صوفی یعنی اُونی لباس پہننے والے کہلانے لگے۔ صُوف کے معنی اُون ہے۔

عقیدہ کو صوفی عقائد میں شامل کیا تھا اور بارھویں صدی میں ہسپانوی عرب ابن عربی نے نوافلاطونی فلسفے سے وحدت الوجود کے نظریہ کو مستعار لے کر تصوف کو فلسفے کی بنیاد پر کھڑا کیا تھا، جس طرح امامؒ غزالی کے علمِ کلام کے زیر اثر تھامس ایکینز نے تھیولوجی کے لئے جگہ ہموار کی تھی اور جس طرح بیسویں صدی کے شروع میں یورپی سرمایہ داروں کے جمہوری اداروں کو علامہ شبلی اور دوسرے مسلمان رہنماؤں نے عین اسلام اور ترکی میں ۱۹۰۹ء کے دستوری انقلاب کو "وامرھم شوریٰ بینھم" کی سچی تعبیر قرار دیا تھا، اسی طرح آج سرمایہ داری اور جاگیرداری کے دورِ انحطاط میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی فاشسٹ فکر و عمل اور نظامِ حکومت کو اسلامی حکومت کے نام سے پیش کرتے ہیں۔

جماعت اسلامی جاگیرداری اور سرمایہ داری کو مضبوط و مستحکم رکھنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ مولانا مودودی وسائلِ پیداوار کی شخصی ملکیت کو "مستحقِ احترام" اور سماج میں زرداروں اور ناداروں میں تمیز اور طبقوں کی موجودگی کو "خدا کی بنائی ہوئی فطرت کا تقاضا" اور "نیکی کی شکل" قرار دیتے ہیں اور

---

(۱) امام غزالی (۱۰۵۸ء تا ۱۱۱۱ء) نے اپنے علمِ کلام کی عمارت اسلامی عقائد، یونانی فلسفہ و منطق اور تصوف کی آمیزش پر کھڑی کر کے نہ صرف محدثین، مفسرین اور فقہا کو متاثر کیا جو اب تک علومِ عقلیہ سے نفرت کرنے اور نقل و تقلید پر زور دیتے تھے، بلکہ یورپ کے مسیحی پادریوں کو بھی ایک نئی راہ دکھائی۔ چنانچہ امام غزالی کے علمِ کلام سے متاثر ہو کر انہوں نے تھیولوجی کی عمارت تعمیر کی۔ جدید سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں یورپ کے فلاسفر قرونِ وسطیٰ کے سکالسٹک ازم کی حدود توڑ کر آگے بڑھے مگر مسلمان علماء اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں بارھویں صدی میں تھے۔

اپنی تصانیف میں اگر زرداروں کی مذمت کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ان کی معاشرت ومعیشت میں "بے اگاہی" سے "کمیونزم کی وبا" بڑھ رہی ہے۔ غرضیکہ مولانا مودودی زرداروں کی مذمت اُن کے دشمن ہونے کے سبب سے نہیں بلکہ دوست اور غمخوار ہونے کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ حقیقی نفرت انہیں وسائل پیداوار کو قومی ملکیت بنانے اور زرداروں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف عوام کی روٹی، زمین، روزگار، آزادی اور جمہوریت کے لئے جدوجہد سے ہے۔ چنانچہ عوام کی اس جدوجہد کو وہ "خدا کے بنائے ہوئے فطری قوانین اور اسلام کے پاکیزہ اصولوں کے خلاف جنگ نیز "دہریت" اور "بدی کی شکل" قرار دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ اس "بدی کی شکل" کو مٹانے کے لئے انہوں نے اشتراکیت کے خلاف "فکری اور عملی جنگ جاری کر رکھی ہے"۔

اشتراکیت کے خلاف جماعت اسلامی کی "فکری اور عملی جنگ" کا مقصد جاگیرداری اور سرمایہ داری کو محفوظ اور مستحکم رکھنے کے لئے مسلمانوں کو عوامی آزادی کی تحریکوں سے الگ تھلگ رکھنا ہے۔ "کمیونزم کو اسلام کا دشمن" قرار دینے سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان اسلامی نظامِ حکومت کو "متوسط راہ" کے طور پر پیش کرنے اور خلافتِ راشدہ کے عہد کا نظام حکومت قائم کرنے کی باتیں کرنے کا مقصد یہی ہے۔

کمیونزم اور اسلام کو ایک دوسرے کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش حکمران طبقوں کی بہت بڑی عیاری اور عوامی تحریکوں کے خلاف بہت بڑی سازش ہے۔

لے پڑھیے "اسلام کا نظام حیات" مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام ایک مذہب ہے اور کمیونسٹ سماج وہ سماج ہے جس میں وسائل پیداوار قوم کی مشترکہ ملکیت ہوں گے جس میں کوئی سرمایہ دار اور مزدور نہیں ہوگا جس میں کوئی جاگیردار اور مزارعہ نہیں ہوگا، جس میں کوئی انسان دوسرے انسان کا اور کوئی قوم دوسری قوم کی غلام اور محکوم نہیں ہوگی۔ دنیا کی دوسری تمام قوموں کی طرح مسلمان بھی قبائلی، غلام داری، جاگیرداری اور سرمایہ داری سماج کی منزلیں طے کرکے کمیونسٹ سماج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اگر قبائلی، غلام داری، جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام اسلام کے دشمن نہیں تھے تو کمیونسٹ نظام بھی نہیں ہے۔

خلافتِ راشدہ کے عہد کا نظامِ حکومت عربوں کے سماجی ارتقاء کے ایک مخصوص دور کا پرتو تھا۔ اسے قائم کرنے کے لئے وہی وسائل پیداوار، وہی سماجی ڈھانچہ اور وہی حالات درکار ہیں جو اس زمانہ میں تھے۔ مگر اب وہ پرانا سماجی نظام وہ پیداوار کے پرانے طریقے اور رشتے دوبارہ قائم نہیں کئے جا سکتے۔ تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی۔ زمانہ پیچھے کی طرف کبھی نہیں دوڑتا۔ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو، مستقبل کے لئے مینارِ نور کا فریضہ کبھی ادا نہیں کر سکتا۔ پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے آگے چلنے والے ہمیشہ گرتے اور ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ مسلمانوں کے تنزل کا سبب یہی ہے کہ وہ بوسیدہ جاگیرداری نظام سے چمٹے ہوئے ہیں۔ مستقبل کو روشن بنانے کا انحصار موجودہ تاریخی دور کے تقاضوں کو سمجھنے اور شعوری طور پر اُن تقاضوں کے مطابق اپنی اقتصادی سیاسی اور سماجی زندگی کو بدلنے پر ہے۔

مارکسزم ایک فلسفہ، ایک سائنس اور ایک کائناتی تصور ہے۔ دیگر تمام سائنٹیفک علوم کی طرح مارکسزم کی بنیاد بھی انسانی تجربات پر ہے۔ جس طرح کیمیا

اور طبیعیات طبعی سائنس ہیں، جس طرح حیوانیات اور طب حیاتی سائنس ہیں اسی طرح مارکسزم معاشرتی سائنس ہے اور کائنات اور سماج میں لگاتار تبدیلیوں کے اصول پیش کر کے ان کی وضاحت کرتا ہے۔ جس طرح سقراط، افلاطون اور ارسطو کے تصورات نے جاگیرداری اور روسیو، والٹر، کابڈن اور ملز وغیرہ کے تصوّرات نے سرمایہ داری کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی رجحانات کی ترجمانی کی، اسی طرح مارکسزم مزدور طبقہ اور اشتراکی سماج کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی تصورات کو پیش کرتا ہے۔ چنانچہ مارکسزم کے معاشرتی تصورات کی روشنی میں سوشلزم کے لئے جدوجہد کرنا موجودہ تاریخی دور کا تقاضا ہے۔ مارکسزم کے مقابلے میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے معاشی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی تصورات کی شکست تاریخ کے صفحات پر لکھی جا چکی ہے۔ ان فرسودہ تصورات کے لئے آنے والے دور میں ایک ہی جگہ ہے۔ وہ جگہ عہد عتیق کی اشیاء کا عجائب گھر ہے۔

سوویٹ یونین کے تقریباً تین کروڑ مسلمانوں نے تاریخی دور کے نئے تقاضوں کو سمجھا اور سامراجی غلامی سے نجات حاصل کر کے سوشلزم کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ مسلمانوں کی چھ بڑی سوشلسٹ سوویٹ جمہوریتیں (تاجکستان، ازبکستان ترکمانستان، کازخستان، کرغزیہ اور آذربائیجان) پامیر اور کوہ قاف کے پہاڑوں، دریائے جیحون اور سیحون کی وادیوں، وسط ایشیا کے کھتانوں اور ریگستانوں میں زندگی کے ہر شعبہ میں حیرت انگیز ترقی کر کے احیاء کے نئے دَور کا آغاز کر چکی ہیں۔ آزاد مسلمان قوموں کی اس صف میں گذشتہ پانچ سال سے البانیہ، بلغاریہ،

رومانیہ، ہنگری اور پولینڈ کے تقریباً ایک کروڑ مسلمان بھی شامل ہو چکے ہیں اور اب ہماری آنکھوں کے سامنے چینی ترکستان اور دوسرے چینی صوبوں کے تقریباً چھ سات کروڑ مسلمان بھی سامراجی غلامی سے آزادی حاصل کر کے سوشلزم کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ غرضیکہ دنیا کے تقریباً چالیس کروڑ مسلمانوں میں سے گیارہ بارہ کروڑ مسلمان سوشلزم کا راستہ اختیار کر چکے ہیں۔ جدوجہد ویٹ نام، سیام، برما، ملایا اور انڈونیشیا میں بھی ہو رہی ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ان ممالک کے تقریباً ۹ کروڑ مسلمان سامراجیوں اور اپنے اپنے ملک کے رجعت پسند حکمرانوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں شریک ہیں۔ یہی حال ہندوستان کے تقریباً تین کروڑ مسلمانوں کا ہے جو بہت بڑی تعداد میں کمیونسٹوں کی صفوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ جدوجہد پاکستان سمیت باقی تمام مسلمان ممالک کے تقریباً چودہ پندرہ کروڑ عوام بھی کر رہے ہیں۔ مگر جب تک جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی سیاست کا پردہ چاک نہ ہو، ان ممالک کے مسلمان اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو کر ترقی کی طرف قدم نہیں رکھ سکتے۔ جماعتِ اسلامی کی سیاست اسلام کے نام پر بوسیدہ جاگیرداری اور زوال پذیر سرمایہ داری کو مضبوط و مستحکم رکھنے کی سیاست ہے۔ پاکستان کے مسلمان اس وقت تک تنزل اور تباہی کے دور سے نہیں نکل سکتے جب تک ان کے دل و دماغ پر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی سیاست مسلط ہے۔ مسلمان ترقی اُسی صورت میں کر سکتے ہیں، جب وہ موجودہ تاریخی دور کے تقاضوں کو سمجھ کر ان تقاضوں کے مطابق اپنی اقتصادی، سیاسی اور سماجی زندگی کو شعوری طور پر بدلنے کی جدوجہد کریں۔

اخلاقی تصوّرات

اخلاقی ذرائع سے مسائل کا حل

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تسلیم کرتے ہیں کہ زرداروں کی معاشرت و معیشت میں "بے لگامی" سے وسائل پیداوار چند ہاتھوں میں مرکوز ہو رہے ہیں۔ مگر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ معاشرت و معیشت میں بے لگامی سرمایہ داری کے مخصوص اقتصادی سیاسی اور سماجی نظام کا منطقی نتیجہ ہے۔ وہ سماج کی مختلف طبقوں میں تقسیم کو "خدا کے بنائے ہوئے قوانین کا تقاضا سمجھتے ہیں"۔ مگر ان قوانین کے منطقی نتیجہ طبقاتی جدوجہد کو "اسلام کے پاکیزہ اصولوں کے خلاف جنگ" قرار دیتے ہوئے طبقاتی مصالحت پر زور دیتے ہیں۔ ملتان جیل سے رہا ہونے کے بعد ۱۵۔ جون ۱۹۵۰ء کو ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:-

"۔۔۔۔ جماعتِ اسلامی کے لئے مجلس شوریٰ نے

ایک ایسا لائحۂ عمل بنایا ہے، جس کے ذریعے سے ملک میں طبقاتی جنگ کی آگ بھڑکنے کو روکا جائے اور مالکانِ اراضی اور مزارعین کے درمیان اسلامی عدل اور اخلاقی فیاضی کی بنیاد پر مصالحت کرائی جائے۔

"مزدوروں، پیشہ ور طبقوں اور کم تنخواہ پانے والے ملازمین کے معاملے میں بھی مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب تک جماعت کے ارکان اس سلسلہ میں متفرق طور پر جو کام کر رہے تھے، اب اُس کو منظم کر لیا جائے اور جگہ جگہ ایسی تنظیمات قائم کی جائیں، یا قائم شدہ تنظیمات کی ایسے طریقہ سے اصلاح کی جائے" جن کا مقصود ایک طرف ملک کے کارکن عناصر کی دینی اور اخلاقی حالت کو سنوارنا اور دوسری طرف ان کی جدوجہد کو طبقاتی کشمکش سے طبقاتی مصالحت کی جانب موڑ دینا ہو۔ اس غرض کے لئے جماعت اسلامی محنت کرنے والوں اور محنت لینے والوں میں متوازی کام کرے گی اور دونوں طبقوں کو اخلاقی ذرائع سے ایک نقطۂ عدل پر متفق کرنے کی کوشش کرے گی۔ . . ."

(تسنیم ۱۷- جون ۱۹۵۰ء)

اخلاقی معیار بلند کرنے کا طریقہ

غرضیکہ مولانا مودودی عوام کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ تمام مسائل جو موجودہ اقتصادی سیاسی اور سماجی نظام میں حل نہیں ہو سکے، اخلاقی ذرائع سے زرداروں

اور ناداروں کو "ایک نقطہ عدل" پر متفق کرنے سے حل ہو سکتے ہیں۔ ضرورت صرف انسانوں کی "دینی اور اخلاقی حالت سنوارنے" اور "انسان کو انسان بنانے" کی ہے۔

اور مولانا مودودی کے نزدیک انسان کو انسان بنانے اور اس کے اخلاق کو بلند کرنے کا واحد راستہ جزا و سزا کے عقیدہ پر اعتقاد ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"... خدا کا خوف، آخرت کی بازپرس کا اندیشہ اور ابدی مستقبل کی خرابی کا اندیشہ ہی تنہا انسان کو انسان بنا سکتا ہے اور اس کے اخلاق کو بلند کر سکتا ہے۔"

(اسلام کا نظام حیات، مصنفہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

غرضیکہ جماعتِ اسلامی کے نزدیک زرداروں کی معاشرت و معیشت میں بے لگامی سے پیدا شدہ اقتصادی، سیاسی اور سماجی مسائل کو حل کرنے کا واحد "صحیح اسلامی راستہ" خدا کا خوف اور آخرت کی بازپُرس کا اندیشہ پیدا کر کے انسانوں کے اخلاق کو بلند کرنا ہے۔

مگر تورات، انجیل اور قرآن مجید کے مطالعہ سے یہی سبق حاصل ہوتا ہے کہ تقریباً سب کے سب نبیوں نے احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرنے پر خدا کا قہر نازل ہونے کی پیشگوئیاں کر کے اپنے اپنے عہد کے زردار اور غاصب حکمرانوں کے اخلاق بلند کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ حکمرانوں نے نہ صرف اپنے غلاموں اور محکوموں پر ظلم و تشدد بدستور جاری رکھا بلکہ مظلوموں کی حمایت و امداد کرنے والے نبیوں پر بھی بڑے بڑے ظلم کئے۔ خود رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کو بھی قریش امرا کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مکہ سے ہجرت کرنی پڑی تھی۔

گیارھویں صدی عیسوی میں جب صوفی منش فلسفی عالم امام غزالی نے قوم کی اخلاقی پستی پر ٹھنڈے دل سے غور کیا تو علماء ہی کو تمام قوم کی بد اخلاقی کا ذمہ دار ٹھہرایا، آپ فرماتے ہیں:

"رعایا اس وجہ سے ابتر ہو گئی کہ سلاطین کی حالت بگڑ گئی اور سلاطین کی حالت اس وجہ سے بگڑی کہ علماؔ کی حالت بگڑ گئی اور علماء کی خرابی اس وجہ سے ہے کہ جاہ و مال کی محبت نے اُن کے دلوں کو چھپا لیا ہے[۱]"

امام غزالی نے اپنی مشہور تصانیف احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت میں غرور، جاہ، ریا وغیرہ عیوبِ نفسانی کا سب سے زیادہ مرتکب علماؔ کو قرار دیا اور سلاطین علماؔ اور رعایا کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے کے لئے اخلاقی مضامین اور کتابیں لکھ کر اخلاقی تصنیفوں اور نظموں کے دَور کا آغاز کیا۔ مگر جہاں تک سلاطین اور علماءؔ کے اخلاقی معیار کا تعلق ہے اس پر نہ امام صاحب موصوف کی اپنی تصنیفوں، نہ اخلاقِ ناصری، اخلاقِ جلالی اور اخلاقِ محسنی جیسی اخلاقی تصنیفوں اور نہ حکیم سنائی، خواجہ فرید الدین عطار، مولانا رومؔ سعدی شیرازی وغیرہ صوفی شعرا کی اخلاقی نظموں کا کوئی دائمی اثر ہوا۔ مسلمانوں کے عام اخلاقی معیار کا تعلق خدا اور یومِ آخرت کے اعتقاد پر ہوتا تو کم از کم علما کا اخلاقی معیار ہمیشہ بلند رہتا اور امام غزالی کو اُن کی اخلاقی پستی پر آنسو بہانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

---

[۱] احیاء العلوم باب امر بالمعروف نیز دیکھئے الغزالی مصنفہ مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۱۸۹

مارکسزم اور اخلاق

کارل مارکس کے نزدیک نیکی و بدی، خیر و شر، حق و باطل، ظلم و تشدد وغیرہ سے متعلق اخلاقی تصورات انسان کی حقیقی زندگی میں اس کی خواہشات اور آرزوؤں کا عکس ہوتے ہیں۔ وہ کسی انفرادی مفاد سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان کا براہِ راست تعلق انسانی معاشرے کی اجتماعی افادیت سے ہوتا ہے۔ وہ قائم بالذات شے نہیں، ہمیشہ انسان کی مادی ضروریات اور مادی حالات کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں اور مادی حالات و ضروریات اور پیداوار کے مادی طریقوں کے بدلنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنا چولا بدلتے رہتے ہیں۔[1]

فریڈرک اینگلز کی بھی یہی رائے ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

... "نیک" اور "بد" کا تصور ایک دور میں دوسرے دور سے اور ایک قوم کا دوسری قوم سے مختلف رہا ہے ... "نیک اور بد" کے متعلق انسانی تصورات ہمیشہ بدلتے رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام تاریخی ادوار میں اخلاقی قدریں ایک نہیں تھیں۔ وہی اخلاقی اصول تھے جنہوں نے ایک زمانے میں اخلاقی بلندی کا اظہار کیا۔ دوسرے زمانہ میں اخلاقی پستی کا مظاہرہ کیا۔[2]

---

[1] سوشلزم اینڈ ایتھکس مصنفہ ہاروڈ سل سم صفحہ ۶۵۔

[2] قاطع ڈوہرنگ۔ باب ۹ واں صفحہ ۸۷۔

زمانہ ماضی کے اخلاقی تصورات

ایک وقت وہ بھی تھا جب مردم خوری اخلاقی پستی کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی
بورنیو میں آج بھی کئی قبیلے مردم خور ہیں۔ خوراک کی انتہائی قلت مردم خوری
کا بنیادی سبب تھا مگر جب ایک طرف کھیتی باڑی کرنے والی اور دوسری طرف
مویشی پالنے والی تہذیبوں کا نشوونما ہوا اور قبیلے آپس میں اشیاء کا تبادلہ کرنے
لگے۔ تو اپنی ضروریات کے علاوہ دوسروں کی ضروریات پیدا کرنے کے لئے
انسانی محنت کی زیادہ سے زیادہ ضرورت پڑی۔ چنانچہ مفتوح قبیلوں کے افراد
کو قتل کرکے کھاجانے کے بجائے غلام بنانے کے رواج کی بنیاد پڑی۔ اخلاقی
اور مذہبی تصورات و عقائد بدل گئے۔

مشترکہ مفاد، مشترکہ ملکیت، مشترکہ دشمن اور مشترکہ خطرہ نیز کہستانوں، پہاڑی
وادیوں اور ریگستانوں کی سخت دشوار زندگی — ان سب نے قدیم قبیلوں کی
اندرونی تنظیم اور ڈسپلن کو اس قدر مضبوط کر رکھا تھا کہ قبیلہ سے باہر یا اس کے
مقابلہ میں فرد کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ سب سے بڑی سزا قبیلہ سے اخراج تھا اور
عربوں کے مشہور شاعر امراءالقیس کا یہ شعر جس کا پہلے بھی حوالہ دیا گیا ہے کہ "قبیلے
کے مفاد پر اپنا ذاتی مفاد قربان کردو حتیٰ کہ اپنی محبوبہ کو بھی چھوڑ دو" اس دور
کے قبائلی اخلاق کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

عہدِ رسالت سے پہلے صحرائے عرب کے بدو قبیلے چشموں کے قریب
چراگاہوں میں کھجور کے درختوں تلے خیموں میں رہتے۔ چاند سورج اور ستاروں

نیز چشموں، چراگاہوں اور غاروں کو دیوی دیوتا سمجھ کران کی پرستش کرتے اور رات کے وقت چاند کی چاندنی میں سفر کرتے اور مویشی چراتے تھے۔ آبادی بڑھ رہی تھی مگر خوراک چشموں اور چراگاہوں کی قلت تھی چنانچہ ایک دوسرے سے چشمے، چراگاہیں اور مویشی چھیننے کے لئے قبیلوں کی آپس میں ہر وقت جنگ رہتی تھی۔ اس زمانے میں حملہ کر کے دوسرے قبیلوں کو شکست دینا، شکست خوردہ قبیلوں کی چراگاہوں، چشموں اور مویشیوں پر قبضہ کر کے خیموں کو لوٹنا اور مردوں کو قتل کر کے (کیونکہ خوراک کی قلت اور انسانی محنت کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے بدو عرب غلام نہیں بناتے تھے۔) عورتوں کو اپنی کنیزیں بنا لینا، نہ صرف قبائلی رسم و رواج اور اخلاق کی بلندی بلکہ بہادری کی شرط تھی۔ اس زمانے کے عرب شعرا نے اپنے اپنے قبیلوں کی بہادری عظمت اور اخلاقی بلندی کے ثبوت میں انہی کارناموں کو فخریہ نظم کیا ہے۔

مگر صحرائے عرب سے نکل کر جب عربوں نے عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایران کے زرخیز خطوں پر قبضہ کیا اور کھیتی باڑی کے علاوہ صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ انسانی محنت کی ضرورت پڑی تو جنگی قیدیوں کو قتل کر دینے کے بجائے انہیں غلام بنا لینے کی اسلامی تلقینات پر عمل پیرا رہنے میں عربوں نے کوئی دقت محسوس نہ کی اور عربوں کے پرانے اخلاقی تصورات بدل گئے۔

قدیم غلام داری سماج اُس وقت تک مضبوط و مستحکم رہی جب تک سپہ سالار دوسرے ملکوں کو فتح کر کے حکمران طبقوں کے لئے دولت اور غلام لاتے رہے مگر فتوحات کا دور ختم ہونے سے جب دولت اور غلاموں کی آمد رک گئی

تو قدیم غلام داری سماج زرعی اور صنعتی تنزل نیز مالی و تجارتی بحران کے دور میں داخل ہوئی اور غلاموں اور ان کے آقاؤں کے مابین طبقاتی جنگ چھڑ جانے سے پرانا نظام درہم برہم ہوگیا اور اُس کے کھنڈرات پر جاگیرداری نظام قائم ہوا۔

غلام داری کے عہد میں پیداوار کے سب اوزاروں کی طرح غلام بھی پیداوار کے اوزار اور مالکوں کی ذاتی ملکیت تھے۔ مالک نہ صرف انہیں خرید اور بیچ سکتے تھے بلکہ قید اور قتل بھی کر سکتے تھے۔ جاگیرداری کے دور میں جاگیردار اپنے زرعی غلاموں، مزارعوں اور کاشت کاروں کو نہ قتل کر سکتے تھے اور نہ ان کی خرید و فروخت کر سکتے تھے۔ وہ زمین سے بندھے ہوئے تھے اور جب زمین یا جاگیر ایک کے قبضہ سے نکل کر دوسرے کے قبضے میں جاتی تھی، تو ساتھ ہی اس زمین کے مزارعوں کاشتکاروں اور زرعی غلاموں کے آقا بدل جاتے تھے۔ غلام داری کی نسبت یہ سماجی نظام بہتر سمجھا جاتا تھا اور غلام داری جو کسی زمانے میں ایک اونچے سماجی نظام اور بلند اخلاقی تصورات کا اظہار کرتی تھی، اب ایک بوسیدہ سماجی نظام اور اخلاقی گراوٹ کی نشانی بن گئی۔

عہد سرمایہ داری کے اخلاقی تصوّرات

جاگیرداری کے دَور میں زراعت، صنعت اور تجارت نے ترقی کی۔ تجارتی راستوں پر آباد قصبے اور بندرگاہیں تجارتی اور صنعتی شہر بن گئے اور رفتہ رفتہ صورت یہ پیدا ہوئی کہ زراعت، صنعت اور تجارت کی ترقی جاگیرداری کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام میں رُک گئی۔ صنعت کی ترقی کے لیئے ارزاں

اُجرت پہ کام کرنے والے مزدوروں کی ضرورت تھی مگر جاگیرداری کے رسم ورواج، قوانین اور اخلاق زرعی غلاموں اور مزارعوں کو اپنے جاگیردار کی زمین چھوڑ کر محنت ومشقت کرنے کے لئے شہروں میں آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ صنعت کی ترقی کے لئے ارزاں سے ارزاں قیمت پر خام مال حاصل کرنے کی ضرورت تھی مگر زمینوں پر قابض ہونے کے سبب اناج اور خام مال پر جاگیرداروں کا مکمل اجارہ تھا۔ چنانچہ نئی پیداواری طاقتوں کی نمائندگی کرنے والے تاجروں اور کارخانہ داروں کے لئے جاگیرداری بادشاہت کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی طاقت کو توڑنا اور تمام اختیارات کو اپنے ہاتھوں میں لینا ناگزیر ہوگیا۔ چنانچہ جاگیرداری اور مطلق العنان بادشاہت کے پرستار تصورات، خیالات اور اخلاقی نظریوں کے مقابلے میں جو بادشاہ کو ظل اللہ قرار دیتے تھے۔ جدید سرمایہ داری کے حامی فلسفیوں مثلاً والٹیر، روسیو وغیرہ نے آزادی، مساوات، اخوت اور عوام کی حاکمیت اور جمہوریت کے اقتصادی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی تصورات پیش کئے اور سرمایہ داری کی رہنمائی میں عوامی جدو جہد سرمایہ پرستانہ جمہوری انقلابات کے دور میں داخل ہوئی۔ ان جمہوری انقلابات نے جاگیرداروں اور بادشاہوں سے طاقت و اختیارات چھین کر مزارعوں اور کاشتکاروں کو جاگیرداروں کے پنجہ سے آزادی دلائی اور پرانے جاگیرداری نظام کے کھنڈرات پر نئے اقتصادی سیاسی اور سماجی سرمایہ داری نظام کی عمارت تعمیر کرکے سیاسی سماجی اور اخلاقی تصورات بدل دیئے۔

چنانچہ کوئی اخلاقی تصور قائم بالذات نہیں ہے۔ اخلاقی تصورات حقیقی زندگی میں انسانوں کی مادی ضروریات اور مادی حالات کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں اور

پیداوار کے اوزاروں اور ان کی بدولت پیداوار کے مادی طریقوں میں تبدیلی کے ساتھ جب انسانوں کے مادی حالات اور باہمی تعلقات بدلتے ہیں، تو اخلاقی تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ ہماری موجودہ سرمایہ داری سماج چونکہ تین مختلف بڑے طبقوں یعنی جاگیرداری، سرمایہ داروں اور مزدوروں پر مشتمل ہے۔ اس لئے تینوں کے اخلاقی تصورات جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہماری موجودہ سماج میں موجود ہیں۔ فریڈرک اینگلز لکھتے ہیں:

"... ہمارے موجودہ سماجی نظام میں متعدد تاریخی ادوار کے اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک جاگیرداری زمانے کا مسیحی اخلاق ہے جو زمانۂ ماضی سے ورثہ میں ملا ہے اور دو بڑی شاخوں میں منقسم ہے۔ ایک کیتھولک اخلاق ہے اور دوسرا پروٹسٹنٹ اخلاق۔ ان دونوں کی بہت سی شاخیں ہیں ... جاگیرداری دور کے تمام اخلاقی اقدار کے علاوہ اس وقت ایک اخلاقی تصور جدید سرمایہ داری کا ہے اور دوسرا مزدور طبقے کا۔ یورپ کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی اس وقت تین قسم کے اخلاقی تصورات موجود ہیں۔ ایک زمانہ ماضی کے اخلاقی اقدار ہیں۔ ایک موجودہ زمانے کے اور ایک آنے والے زمانے کے ... جدید سماج تین طبقوں (جاگیردار، سرمایہ دار اور مزدور) پر مشتمل ہے اور تینوں کے اخلاقی تصور ایک دوسرے سے مختلف ہیں ..."

(قاطع ڈوہرنگ۔ باب نواں صفحات ۸۸ اور ۸۹)

جدید سرمایہ داری نظام میں نفع کمانے کے لئے اشیاء کی پیداوار اور خرید و فروخت نے تمام رشتوں، حتیٰ کہ خاندانی رشتوں کو بھی خالص تن پروری اور محض لین دین کے رشتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ چنانچہ تجارتی مقابلہ میں ایک دوسرے کو تباہ کرنا، اشیاء سستے بھاؤ فروخت کرنے کے بجائے برباد کر دینا، ذخیرہ اندوزی سے منڈیوں میں چیزوں کی قلت پیدا کر کے انہیں چور منڈیوں میں مہنگے بھاؤ فروخت کرنا، عوام کو بھوکا مار کر تجوریاں روپوں سے بھرنا، نیز مزدوروں، کسانوں اور ادنیٰ درمیانہ طبقوں کے خون پسینہ کی کمائی کو عریاں اور حیا سوز طریقوں سے لوٹنا بیوپار کے اصولوں اور سرمایہ داروں کے اخلاق نیز قوانین میں شامل ہے۔ اور صنعتی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس ماندگی کے باوجود ہمارے برِاعظم ایشیا اور برصغیر ہندوستان اور پاکستان میں بھی یہی حالات پیدا ہو چکے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مغربی یورپ اور ترقی یافتہ دوسرے ممالک میں سرمایہ دار طبقے نے پیداوار اور نقل و حمل کے وسیلوں میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر کے تمام جاگیری پدرسری قبیلی اور دیہاتی رومانوی تعلقات کو ختم کر دیا ہے اور ایشیائی ممالک میں یہ تبدیلی مکمل طور پر نہیں ہوئی جس طرح پیداوار کے قدیم وسیلوں (مثلاً ہل، درانتی، چرخہ، ہتھوڑا، بیل گاڑی) کے ساتھ ہی ساتھ جدید وسیلے (مثلاً ٹریکٹر، دیو ہیکل مشینیں، ریلوے، موٹریں، ہوائی جہاز) رواج پا رہے ہیں اسی طرح جاگیری پدرسری قبیلی اور دیہاتی رومانوی تعلقات موجود ہیں مگر جدید سرمایہ داری نے ان میں نیز خاندانی رشتوں، ذاتی جوہر، مذہب، سیاست اور اخلاق میں نفع کے لئے لین دین کا کٹھور پن پیدا کر دیا ہے

ہمارے اپنے وطن پاکستان میں یہ کٹھور پن گذشتہ چار سال کے عرصہ میں کئی

گنا بڑھ گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انگریز سامراجیوں نے نوآبادیاتی نظام کو قائم رکھتے ہوئے اور اپنی لوٹ کھسوٹ کو بڑھاتے ہوئے پاکستانی تاجروں کے اونچے طبقے کو عوام کے خون پسینہ کی کمائی کو لوٹنے کی آزادی اس وقت دی ہے جبکہ سرمایہ داری نظام ساری دنیا میں دائمی اقتصادی بحران کے مرض میں مبتلا ہو کر پیداوار بڑھانے اور سماج کو آگے لے جانے کی صلاحیتیں کھو بیٹھا ہے۔ غرضیکہ ہمارے ملک کے سرمایہ دار پیدا اس وقت ہوئے ہیں جبکہ ساری دنیا میں ان کا طبقہ بوڑھا ہو کر قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ چنانچہ وہ ایک طرف بچپن کے الھڑپن، ناتجربہ کاری اور کمزوری (صنعتی و مالی کمزوری) اور دوسری طرف بڑھاپے کی بیماری (زرعی، تجارتی اور مالی بحران) اور نقاہت کے سبب پاکستانی عوام کو زیادہ سے زیادہ لوٹ کر جلدی سے جلدی دنیا کے بڑے سرمایہ داروں کی صف میں شامل ہونے کے لئے انگریز اور امریکی سامراجیوں کی امداد کا محتاج ہے اور ان سے ناطہ توڑ کر ملک کو ان کے اقتصادی، سیاسی اور فوجی اقتدار سے آزاد کرنے اور جاگیرداری اور بڑی زمینداری کو بلامعاوضہ ختم کر کے زمینوں کو حقیقی کاشت کاروں میں بانٹ دینے کی ہمت، جرأت اور طاقت نہیں رکھتا۔ وہ اس قابل نہیں کہ صنعت و حرفت کو ترقی دے سکیں اور اپنے غلاموں، مزدور اور کسانوں کے معیار زندگی کو لگاتار گرنے سے بچا سکیں۔ وہ اس قابل نہیں کہ مہاجرین کو جنہیں خود ان کی دیوالیہ سیاست نے برباد کر دیا ہے، زمین، روٹی، روزگار اور مکان مہیا کر سکیں۔ وہ اس قابل نہیں کہ اپنے لوازماتِ زندگی کو ہمہ گیر قوانین کا درجہ دے کر سماج پر چسپاں کریں اور اس قابل بھی نہیں کہ سرکاری محکموں میں

رشوت ستانی، بدعنوانی اور نا اہلیت کے انسداد کے لئے نظم و نسق میں اصلاح کر سکیں۔ ان کا مقصدِ زندگی صرف جلدی سے جلدی دولت مند بننا ہے اور جلدی سے جلدی دولت مند ہونے کے لئے وہ دوسرے ملکوں سے اشیاء خریدتے اور اجارہ دار ہونے کے سبب سے مہنگے بھاؤ فروخت کرتے ہیں اور صنعت کو ترقی دے کر ملک کی دولت بڑھانے سے گریز کرتے ہیں۔ چنانچہ عوام کا معیارِ زندگی گر رہا ہے اور ان کی مصیبتیں بڑھ رہی ہیں۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام میں بے چینی تیزی سے پھیل رہی ہے، اور اس عوامی بے چینی کو منظم تحریک کی شکل اختیار کرنے سے روکنے کے لئے اس ملک کے حکمران طبقے کے نمائندے عوام کو "خلافتِ راشدہ" "اسلامی حکومت" "اسلامی آئیڈیالوجی" اور "اسلامی سوشلزم" کے نعروں میں الجھاتے ہیں۔ انسانوں کے اخلاق بلند کر کے سب مسئلوں کو حل کرنے کی باتیں کرتے ہیں اور جب یہ حربے بھی ناکام ثابت ہوں تو سیفٹی ایکٹ ایسے غیر جمہوری قوانین کو حرکت میں لاتے ہیں۔

موجودہ سرمایہ داری سماج کی بنیاد وسائلِ پیداوار کی ذاتی ملکیت پر ہے۔ چنانچہ سرمایہ داروں کے تمام فلسفی نظام تمام سیاسی، اقتصادی اور سماجی اصول تمام آئین و قوانین اور تمام اخلاقی تصوّرات وسائلِ پیداوار کی ذاتی ملکیّت کا احترام اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

کمیونسٹوں اور سرمایہ داروں کے اخلاقی تصورات

درحقیقت حقوقِ ملکیّت کی حفاظت کا اخلاقی تصوّر سرمایہ داری کے

ابتدائی دور کا تصور ہے جبکہ پیداوار بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی اور کاشتکار اپنی زمینوں، دست کار اپنے اوزاروں اور چھوٹی چھوٹی ورکشاپوں اور تاجر اپنی دکانوں کے مالک تھے۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ سرمایہ داروں اور بڑے زمینداروں نے کاشت کاروں کو ان کی زمینوں، دستکاروں کو اُن کے اوزاروں اور ورکشاپوں اور تاجروں کو ان کی دکانوں سے محروم کرکے پیداوار کے تمام وسیلوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ چنانچہ آج حقوقِ ملکیت کا احترام کرنے والے اقتصادی سیاسی، سماجی اور اخلاقی تصورات کے حقیقی معنی ۹۸ فیصد آبادی کو وسائلِ پیداوار کی ذاتی ملکیت سے محروم کرنے والے ۲ فیصد اشخاص کے حقوقِ ملکیت کا احترام کرنا ہے۔

کمیونسٹ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے اس اخلاقی نظریے کی "ابدی صداقت" کو چونکہ تسلیم نہیں کرتے، اس لئے سرمایہ دار اور جاگیردار اور ان کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی مفاد کے محافظ مذہبی، سیاسی اور تہذیبی رہنما، جن میں جماعتِ اسلامی کے علماء بھی پہلی صف میں شامل ہیں، یہ چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ کمیونسٹ اخلاق کے قائل نہیں۔

کمیونسٹ بیشک اس اخلاق کے قائل نہیں، جو چھوٹی سی اقلیت کے فائدے کے لئے بہت بڑی اکثریت کے مفاد کو قربان کر دینا صحیح سمجھتا ہے، جو کروڑوں انسانوں کو بھوکا مار کر روپیہ کمانے، سستی قیمت پر اشیاء فروخت کرنے کے بجائے کھڑی فصلوں کو آگ لگا دینے اور مالِ تجارت سے بھرے ہوئے جہازوں کو سمندر میں غرق کر دینے کو جائز قرار دیتا ہے۔ وہ بیشک اس اخلاق کے دشمن

ہیں، جو پسماندہ قوموں کی آزادی چھیننے اور انہیں اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے غلام بنانے، رنگ و نسل، قوم، مذہب اور زبان کے اختلاف کی بنیادوں پر عوام میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلانے، جلشیوں پر سر بازار حملے کر کے انہیں ہلاک کرنے اور ملایا کے آزادی پسندوں کے خلاف بورنیو کے مردم خوروں کی خدمات حاصل کرنے کو "ابدی صداقت" قرار دیتا ہے۔

کمیونسٹ سماج اور اخلاقی قدریں

کمیونسٹ ۹۸ فیصد آبادی کو وسائلِ پیداوار کی ذاتی ملکیت سے محروم کرنے والے ۲ فیصد اشخاص کو وسائلِ پیداوار کی ذاتی ملکیت سے محروم کر کے سب کو مالک بنانے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ چنانچہ اُن کے اقتصادی سیاسی سماجی اور اخلاقی نظریوں کی بنیاد وسائلِ پیداوار کی مشترکہ ملکیت پر ہے۔ جس طرح جاگیرداری دور کے اخلاقی تصورات دورِ غلامی کے اخلاقی تصورات سے اور جس طرح عہدِ سرمایہ داری کے اخلاقی نظریے دورِ جاگیرداری کے اخلاقی اقدار سے بلند تھے، اسی طرح آنے والے کمیونسٹ معاشرے کے اخلاقی تصورات جدید سرمایہ داری سماج کے اخلاقی نظریوں سے کہیں زیادہ بلند ہیں۔

فریڈرک اینگلز لکھتے ہیں:

"... ہم تمام گذشتہ اخلاقی قدروں کو سماج کے اقتصادی ادوار کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ چونکہ آج تک سماج طبقاتی کشمکش کے مختلف ادوار میں رہی ہے، اس لئے تمام اخلاقی

نظریے طبقاتی اخلاق کی نمائندگی کرتے رہے ہیں ۔ ان اخلاقی
نظریوں نے یا تو برسر اقتدار طبقوں کے مفاد کی حفاظت کی ہے یا
برسر اقتدار طبقوں کے خلاف مظلوم و محکوم طبقوں کے مفاد کی
حمایت کی ہے ۔ ایک حقیقی انسانی اخلاق صرف اسی سماج میں
نشو و نما پا سکتا ہے ، جس میں طبقاتی کشمکش نہ صرف ختم ہو گئی ہو بلکہ
عملی زندگی میں فراموش بھی ہو چکی ہو "

(فاطع ڈوہرنگ ۔ باب نواں ، صفحہ ۸۹)

زمانہ ماضی کے سماجی شعور اور اخلاقی اقدار اپنے تنوع اور گوناگونی کے
باوجود سماج کے ایک طبقے کے ہاتھوں دوسرے طبقے کے استحصال کو اس
لئے جائز قرار دیتے رہے ہیں کہ معاشرہ طبقوں میں منقسم رہا ہے ۔ اس روایتی
اخلاق سے ، جسے جماعت اسلامی " ابدی صداقت " سمجھتی ہے ۔ کمیونسٹوں کے اخلاقی
تصورات اس لئے بلند اور ایک حقیقی انسانی اخلاق کی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ وہ
ساری دنیا میں ایک ایسا سماجی نظام قائم کرنے کی جد و جہد کر رہے ہیں ، جس میں طبقے
اور طبقاتی کشمکش نہ صرف ختم بلکہ عملی زندگی میں فراموش ہو گی ، جس میں وسائلِ پیداوار
ساری قوم کی ملکیت ہوں گے ، جس میں کوئی کسی دوسرے کی محنت کو غصب کر
کے اپنی تجوریاں روپوں سے نہیں بھرے گا ، جس میں کوئی انسان دوسرے
انسان اور کوئی قوم دوسری قوم کی غلام نہیں ہو گی ، جس میں ترقی یافتہ قومیں پسماندہ
قوموں کو ترقی کرنے میں مدد دیں گی ، اور جس میں سب انسانوں کے حقوق برابر
ہوں گے ، خواہ وہ کسی قوم ، کسی مذہب ، کسی فرقہ ، کسی رنگ اور کسی نسل سے ہوں ۔

یہی وجہ ہے کہ ۴۷-۱۹۴۶ء کے فسادات میں جب قہر الٰہی سے ڈرنے اور دوسروں کو ڈرانے والے ہندو، سکھ اور مسلمان مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کی دیوالیہ سیاست چاقوؤں، چھروں اور تلواروں کی دھاروں سے بہتے ہوئے لہو، پیٹ سے باہر نکلی ہوئی انتڑیوں، پتھروں سے کچلے ہوئے سروں، سسکتی جانوں اور جھلسی ہوئی لاشوں کے مناظر اور دلدوز چیخیں اور فریادیں سن کر خوش ہو رہی تھی اور معصوم بچوں اور کمسن بچیوں کو ذبح کرنے اور نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری کرنے والوں کو "مجاہد" "سنگھ سورما" اور "سورہیر" کے خطابوں سے نواز رہی تھی یعنی انسانی تاریخ میں انسانیت کے خلاف سب سے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہی تھی، اس وقت "پیٹ اور روٹی کا سوال چھیڑ کر انسان کو انسانیت اور شرافت سے گرانے والے[1]" کمیونسٹ ہندوستان اور پاکستان میں اپنے جان و مال کو خطرے میں ڈال کر اقلیتوں کے جان و مال کی جہاں تک ان سے ممکن ہو سکا حفاظت کر رہے تھے[2]۔ اور یہی وجہ ہے کہ چین کی فاتح کمیونسٹ فوجوں کے سپاہیوں نے پیکنگ،

---

[1] اشارہ جماعت اسلامی کے ایک رکن ابو صالح اصلاحی کے ایک مضمون "کمیونزم کی تاریخ، فلسفہ، طریقہ کار، نتائج اور انجام کار" کی طرف ہے جو ۲۵ جولائی ۱۹۴۸ء کے روزنامہ تسنیم میں شائع ہوا تھا۔ آپ لکھتے ہیں:

"اشتراکیت نے پیٹ اور روٹی کی خاطر وہ چیز انسانیت سے چھین لی ہے جس کی بدولت انسان انسان ہوتا ہے۔ اگر خدا اور یوم آخرت کا اعتقاد نہ ہو، اگر طبعی قوانین سے بالاتر ایک اخلاقی قانون کی حکومت نہ ہو، اگر انسان کا انتہائی مطمعِ نظر محض حیوانیت ہی کا نشو و نما ہو، تو راست بازی، وفاداری، اخلاق، امانت، عصمت، عفت، دیانت داری، شرافت، احترام، حقوقِ انسانیت سب کے سب ختم ہو جاتے ہیں۔"

[2] آٹھ سکھ کمیونسٹ مسلمانوں کو بچاتے ہوئے اکالیوں کے ہاتھوں صرف امرتسر کے ضلع میں قتل ہوئے تھے۔

ٹین سین، نانکن، شنگھائی، ہانکاؤ، کانٹن غرضیکہ ہر جگہ اپنے بلند اخلاق کا اس قدر اچھا مظاہرہ کیا کہ سامراجی خبر رساں ایجنسیوں حتیٰ کہ رائٹر اور امریکی سامراجیوں کے اخبارات کو بھی ان کے بلند اخلاق کے مظاہروں کا ذکر کرتے ہوئے تسلیم کرنا پڑا کہ "کمیونسٹ چین کے سپاہی اس دنیا کے نہیں کسی دوسری دنیا کے لوگ ہیں۔"

جنسی اخلاق اور سامراجی پروپیگنڈا

مگر جماعت اسلامی کے علماء سرمایہ داری اور جاگیرداری کو محفوظ اور مستحکم رکھنے کے لئے کمیونسٹوں اور سوویٹ یونین سے عوام کو متنفر کرنے میں اس قدر مصروف ہیں کہ کمیونسٹوں کو بد اخلاق اور سوویٹ سماج کو اخلاقی اعتبار سے گرا ہوا سماج ثابت کرنے کے لئے وہ اپنے مضمونوں اور کتابوں میں انہی خرافات کو جگہ دیتے ہیں جو ۱۹۱۷ء سے سامراجی شائع کر رہے ہیں۔

نومبر ۱۹۱۷ء میں جب انقلاب روس نے دنیا بھر کے سامراجی نظام کو موت کا پیام دیا، تو انگریز حکمرانوں نے اپنے اثر و اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے یہ بساط بچھائی کہ ایشیا، بالخصوص ہندوستان کے غریب اور پسماندہ عوام کو اشتراکی پروگرام کے بارے میں واقعات کے علم سے محروم رکھنے کے لئے پروپیگنڈا کیا جائے کہ اشتراکیت ان کے نازک سے نازک اور مقدس ترین جذبات و احساسات پر حملہ آور ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء سے ہندوستان میں سرکاری اور نیم سرکاری خبر رساں ایجنسیوں اور سرکاری نشر و اشاعت کے محکموں کی طرف سے جھوٹے پروپیگنڈا کی مہم شروع ہوئی کہ "بالشویک وحشی اور ڈاکو ہیں۔" انہوں نے گرجوں اور مسجدوں

کو مسمار کر دیا ہے۔"عورتیں مشترکہ ملکیت" بنا دی ہیں اور خانقاہوں کو قمار خانوں اور شہوت رانی کے اڈوں میں تبدیل کرا دیا ہے۔"حضرت امام بخاری کا مقبرہ گرا دیا ہے اور "علماء فقہا اور مشائخ کو شہید کر دیا گیا ہے[۱]"۔

برعکس اس کے ہندوستان کے مسلمانوں نے دیکھا کہ جس سوویٹ حکومت کی اسلام دشمنی کا شور مچایا جا رہا ہے، اس نے اسلامی دُنیا کے سب سے بڑے اور دیرینہ دشمن زارِ روس کی حکومت کو ختم کر دیا۔ انگریز کمال اتاترک کے دشمن ہیں، مگر سوویٹ حکومت اس کی حکومت کو تسلیم کر کے اسے سامانِ جنگ بھیج رہی ہے۔ زار روس اور برطانیہ نے ایران کی تقسیم کے متعلق جو خفیہ معاہدہ ۱۹۰۸ء میں کیا تھا، اسے سوویٹ حکومت نے شائع کر کے منسوخ کر دیا ہے اور زار نے جو سامراجی مراعات ایران میں حاصل کر لی تھیں، ان سے وہ رضا کارانہ طور پر دستبردار ہو گئی ہے۔ علاوہ اس کے ۱۹۱۹ء میں افغانستان کو ایک آزاد ریاست تسلیم کر کے برطانیہ کو بھی اس کی آزادی تسلیم کرنے پر مجبور کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طاقت کی بدولت ایران، ترکی اور افغانستان کو قومی آزادی اور استحکام نصیب ہوا ہے، وہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمن نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہندوستان میں سوویٹ یونین کے خلاف انگریز حکمرانوں کے پروپیگنڈا کا الٹا اثر ہوا۔ ہندوستان کے علماء اس زمانے میں اسلامی ممالک کی سیاست اور انگریز سامراجیوں کی ریشہ دوانیوں سے باخبر تھے اس لئے جمعیت العلمائے ہند کو انقلابِ روس کی فیصلہ کن حیثیت

---

[۱] "بالشوزم اور ہندوستان" مصنفہ خان بہادر عبدالعزیز ڈائرکٹر محکمہ نشر و اشاعت پنجاب اور ایڈیٹر "حق" لاہور۔ یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں شائع کی گئی تھی۔

سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں جمعیت العلمائے ہند کے اجلاس منعقدہ گیا کے صدر منتخب مولانا حبیب الرحمان نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:

"... کون کہہ سکتا تھا کہ روس کی شخصی حکومت کے
خون سے ایسی حکومت کی آبیاری ہوگی جو تمام مظلوم اقوام کی حمایت
اور عالمِ اسلام کی تقویت اور نئے ترکیہ کی دوستی میں سب سے زیادہ
موثر اور طاقتور آواز بلند کرے گی"

ہمارے ادیب اور شاعر بھی انقلابِ روس کو سمجھنے میں پیچھے نہیں رہے۔ قاضی نذر الاسلام اور جوش ملیح آبادی نے انقلابِ روس سے متاثر ہو کر باغیانہ نظمیں لکھیں اور علامہ اقبال نے انقلاب کا یہ کہہ کر خیر مقدم کیا کہ ؎

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

سوویٹ یونین کے خلاف پروپیگنڈا اور کمیونسٹوں کے خلاف تشدد (۱۹۲۳ء میں پشاور سازش ۱۹۲۴ء میں کانپور سازش اور ۱۹۲۹ء میں میرٹھ سازش کے مقدمات) کے ہتھیار بے اثر ثابت ہوئے، تو انگریز سامراجیوں نے ترکستان اور بخارا سے بھاگے ہوئے امرا اور جاگیرداروں کو منظم کر کے بالشویکوں کے مظالم اور ان کی اسلام دشمنی کی شہادتیں پیش کرنے کی پالیسی وضع کی۔ ۱۹۳۲ء میں حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں کانفرنس ہوئی اور اس میں ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ میں متذکرہ بالا بنیادوں پر بالشوزم کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے پروگرام بنایا گیا۔ چنانچہ حج سے واپس آکر ۱۹۳۳ء میں مولانا محمد ایوب بخاری نے "بیان المظالم

بالشویک" کے نام سے فارسی میں اور "بیخ کنیِ اسلام" کے عنوان سے اُردو میں تصنیفات کا سلسلہ شروع کیا جس میں روسی ترکستان میں اسلام کی تباہی اور مسلمانوں پر بالشویکوں کے مظالم کی من گھڑت خونچکاں داستانیں شائع کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ "محض اتباع شریعت کے جرم میں صدہا علماء قتل کیے گئے ہیں"۔ "نئے مدرسوں میں کم سے کم دو گھنٹے روزانہ خدا، انبیاء اور مشائخ کو گالیاں دی جاتی ہیں"۔ "بالشویک بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک بستر پر سلاتے اور اس طرح ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں حرامی بچے پیدا کر کے نئی تعلیم دیتے ہیں"۔ اور سب سے دلچسپ یہ کہ "بالشویکوں نے اکثر قمار بازوں، شراب خوروں اور لچے لفنگے مردوں اور عورتوں کو مرتد کر کے حکومت کے بڑے بڑے افسر بنا دیا ہے"۔

۱۹۳۵ء میں حکومت کے ایما سے اس فن کا سب سے بڑا شاہکار "اسلام اور اشتراکیت" کے نام سے ایک کتاب دہلی کے ایک خان بہادر اور آنریری مجسٹریٹ حاجی محمد یوسف احمد پانی نے شائع کی اور جیسا کہ سرورق پر درج ہے "بلا قیمت تقسیم کی گئی"۔ دراصل اس کتاب کے مصنف "ایک عالم علوم دینیہ" ہیں، جنہیں اپنا نام ظاہر کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں دلائل وہی ہیں جو اسلام اور اشتراکیت کو متضاد و متصادم ثابت کرنے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اشتراکیت ہر نجی ملکیت کی مخالف اور مادیت کے فلسفہ پر اعتقاد رکھنے کی بدولت نفس پرستی کی حامی ہے۔ اس کے بالمقابل اسلام ملکیت اور سرمایہ داری کے مسئلوں کا حل میراث، زکوٰۃ اور خیرات وغیرہ سے کرتا ہے۔ اشتراکیت کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے والے گمراہ ہیں۔ اشتراکیت اور

اسلام میں بنیادی اختلاف وہی ہے جو "حق و باطل"، "اہرمن و یزدان" اور "خدا اور شیطان" کے درمیان ہے۔ لہٰذا جو اسلام کے نورِ مبین کی موجودگی میں دوسروں کی نظر فریب ضیا پاشیوں کو مشعلِ ہدایت بنائے گا وہ عذابِ الٰہی کا مستحق ہوگا۔"

روسی ترکستان سے بھاگے ہوئے اُمرا اور ہندوستان کے خان بہادروں کا یہ وار بھی خالی گیا۔ اشتراکیت سے خوفزدہ ہونے کے بجائے ایمان دار اور خدا پرست مسلمانوں نے بھی اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے قسطنطنیہ سے ایک دستورِ اساسی ہندوستان بھیجا جس میں نہرو رپورٹ کی اُلجھنوں کو دُور کرنے کے لئے سوویٹ روس کی مثال کو سامنے رکھکر قومی خود ارادیت کے اصول کو تسلیم کرنے کی سفارش کی اور آزادی حاصل کرنے کے لئے ریاستوں کو ختم کرنے اور جاگیرداری کو منسوخ کرنے پر زور دیا۔ مشیر حسین قدوائی نے "بالشوزم اور اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اسلام اور بالشوزم کی باہمی رفاقت اور یگانگت پر زور دیتے ہوئے لینن کی اُس تحریر کا حوالہ دیا، جس میں اُس اشتراکی "لامذہب" نے امیر امان اللہ خاں شاہِ افغانستان کو نصیحت کی تھی کہ افغانوں کے مذہبی جذبات اور مقبولِ عام رسوم کو صدمہ پہنچا کر انقلاب اور سامراج دشمنی کا انقلابی فریضہ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ جمعیت العلمائے ہند کے جنرل سیکرٹری مولانا حفظ الرحمان نے بھی اسی زمانے میں "اسلام کا اقتصادی نظام" ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا، جس میں زور دیا کہ آج ہمارا سب سے مقدم اور سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کے موجودہ معاشی نظام کو جو عام یورپی ممالک کی طرح سرمایہ دارانہ نظام کے بل بوتے

پر چل رہا ہے، درہم برہم کر کے اس نظام میں انقلاب پیدا کر دیں۔ تب مقصدِ عظمیٰ کے حصول کی کوئی راہ نکل سکتی ہے۔" آپ نے مسلمانوں کو یہ بھی یاد دلایا کہ "ہندوستان میں گزشتہ تحریکاتِ قیام حکومت اسلامی کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ یا تو یہ تحریکیں ناکام رہی ہیں اور یا حکومتِ مسلّط کا آلۂ کار بن کر رہ گئی ہیں۔" اور یہ مشورہ دیا کہ "مسلمانوں کو حالات موجودہ میں اسلامی حکومت بنانے کے بجائے مسلمانوں کے مذہبی، کلچرل اور ملّی حقوق کی بنا پر سامراج دشمن جماعتوں سے سمجھوتہ کرنا چاہیئے جو اقتصادی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔" ادیب اور شاعر بھی متاثر ہوئے۔ اُن کے ایک گروہ نے ترقی پسند مصنفین کے نام سے ایک انجمن قائم کر کے روسی ادیبوں کی کہانیوں اور نظموں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ مزدوروں اور کسانوں کے انقلابی جذبات و احساسات کی عکاسی کرنی شروع کی اور علامہ اقبال نے نہ صرف ایک نئے فقہ کی دعوت دی بلکہ خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم دیا کہ ؎

اٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں نازی فوجوں کے خلاف سوویٹ عوام (جن میں تاتاریہ، باشکریہ، داغستان، کازکستان، تاجکستان، ازبکستان، ترکمانیہ، آذربائیجان اور کرغزیہ کے تین چار کروڑ مسلمان بھی شامل ہیں) اور سُرخ فوج کی بہادری اور فتوحات نے کل دُنیا کے عوام کو انگشت بدنداں کر دیا اور کل دنیا کے عوام کی طرح ہندوستانیوں کا رجحان بھی سوویٹ یونین کے حالات کا مطالعہ

کرنے کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ نازی فوجوں کے خلاف سوویٹ حکومت، سوویٹ فوج اور سوویٹ عوام کا اتحاد ایک حقیقت تھی جسے کوئی چھپا نہیں سکتا تھا۔ اپنی حکومت سے متنفر عوام کبھی بہادری سے دشمن کے خلاف جنگ نہیں کر سکتے۔ یورپ کے عوام اپنے اپنے ملک کی سرمایہ پرست حکومتوں سے متنفر اور بیزار تھے۔ اس لئے جس ملک پر ہٹلر نے حملہ کیا اسے دو ہفتوں میں فتح کر لیا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے عوام فرانسیسی، ولندیزی، امریکی اور انگریز سامراجی حکمرانوں سے بیزار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دو تین مہینوں میں جاپانی فوجیں ہند چینی، سیام، ملایا، انڈونیشیا اور برما کو فتح کر کے ہندوستان کی مشرقی سرحد پر پہنچ گئیں۔ سوویٹ عوام میں سے نازیوں کو پانچواں کالم نہ ملنا، سوویٹ یونین میں آباد تقریباً ڈیڑھ سو چھوٹی بڑی قوموں میں سے کسی قوم کا سوویٹ حکومت کے خلاف بغاوت کر کے نازی فوجوں کا خیر مقدم نہ کرنا سوویٹ حکومت کی ہر دلعزیزی کا ثبوت ہے۔ چنانچہ حکومتِ برطانیہ کو اپنی خبر رساں ایجنسیوں کی معرفت نیز دہلی سے "سوویٹ یونین نیوز" انگریزی میں ایک ماہنامہ جاری کر کے اس پروپیگنڈا کی مجبوراً تردید کرنی پڑی جو گذشتہ چوبیس پچیس برس سے وہ کر رہی تھی۔ اسے تسلیم کرنا پڑا کہ سوویٹ حکومت کو مزدوروں، کسانوں اور سوویٹ یونین میں آباد سب قوموں نیز پادریوں اور علماء کی پوری اور سرگرم حمایت حاصل ہے۔ ہر ایک کو اپنے مذہبی عقیدہ کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی ہے۔ مسجدیں اور گرجے آباد ہیں، مسمار نہیں کئے گئے۔ مسلمانوں کی ہر سوویٹ جمہوریت میں جمعیت العلماء ہے۔ عورتیں مشترکہ ملکیت نہیں اور رسمِ نکاح کو منسوخ نہیں کیا گیا۔

سوویٹ نظام کے خلاف جماعت اسلامی کی مہم

مگر جنگ ختم ہوتے ہی انگریز اور امریکی سامراجیوں نے سوویٹ یونین اور کمیونزم کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈا کی مہم کو پھر تیز کر دیا۔ اور بالشویکوں کے مظالم کمیونسٹوں کی بداخلاقی اور عورتوں کے مشترکہ ملکیت ہونے کی داستانیں شائع ہونے لگیں اور مولانا مودودی نے جو دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہونے سے چند سال پہلے میدان میں آچکے تھے، علماءِ ہند کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنا شروع کیا کہ:

"جرمنی کی شکست اور روس کی فتح کی بدولت کمیونزم کو وہ طاقت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ ایک خطرہ بن چکا ہے۔ جس خطرہ کا امکان میں نے "سیاسی کشمکش" کے حصہ اوّل میں ظاہر کیا تھا، وہ اب بالکل قریب آپہنچا ہے۔ اب اگر علمائے کرام ہمارے چونکائے نہ چونکیں گے، اور ہمارے سمجھائے نہ مانیں گے تو کمیونزم انہیں چونکائے گا اور افسوس یہ ہے کہ اس وقت چونکنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا"[ل]

ساتھ ہی اس کے انہوں نے کمیونسٹوں کو بداخلاق اور سوویٹ سماج کو اخلاقی اعتبار سے گرا ہوا سماج ثابت کرنے کے لئے اپنی کتابوں اور مضمونوں میں انہی خرافات کو جگہ دینی شروع کی جو ۱۹۱۷ء سے انگریز سامراجیوں نے اپنے مصنفوں، خبر رساں ایجنسیوں، بخارا اور ترکستان سے بھاگے ہوئے امرا اور علماء نیز خان بہادروں کی معرفت پھیلا رکھی تھیں۔ مثلاً جماعت اسلامی کے ایک رکن ابو صالح اصلاحی اپنے ایک مضمون بعنوان "کمیونزم کی تاریخ، فلسفہ، طریقہ کار، نتائج اور انجام کار" میں

ل "کوثر" ۔ ۱۷ر اگست ۱۹۴۵ء

لکھتے ہیں :

"... اشتراکی سماج میں یہ صورت عملاً پیدا ہو چکی ہے۔ وہاں مرد اور عورت کے تعلقات کو نکاح کی قید سے آزاد کر دیا گیا ہے اور نکاح میں اب کوئی اہمیت اور تقدس باقی نہیں رہا۔ آزادانہ شہوانی تعلقات کو نہ صرف جائز بلکہ پسند کیا جاتا ہے اور اس تخیل کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ایک شخص جس عورت کو اپنی بیوی قرار دے، اس کو صرف اپنے لئے مخصوص رکھے کیونکہ اس میں ان کو ملکیت کی بُو آتی ہے۔ انسانی ضروریات کے تمام وسائل جس طرح ریاست کی ملکیت اور سب باشندوں میں مشترک ہونے چاہئیں اسی طرح بیوی سب کی بیوی اور شوہر سب کا شوہر ہے۔ ایسے آزادانہ تصورات کے نتیجہ کے طور پر جو بچے پیدا ہوں، وہ سب کی ملکیت ہیں" [۱]

عورتوں کا مختلف تاریخی ادوار میں درجہ

فریڈرک اینگلز نے اپنی ایک مشہور کتاب "خاندان ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز" [۲]

---

[۱] "تسنیم" ۲۵- جولائی ۱۹۴۸ء۔

[۲] ORIGIN OF FAMILY, PRIVATE PROPETY AND STATE.

میں ہنری مارگن کی تحقیقات[1] کی بنیادوں پر یہ ثابت کیا ہے۔ کہ قدیم زمانے میں بھائی اور بہن، ماں اور بیٹے اور باپ اور بیٹی کا ازدواج ایک عام شے تھی مرد اور عورت کے جنسی تعلقات رسم نکاح کے پابند نہیں تھے اور یہ کہ کس طرح ذاتی ملکیت کے نشو ونما کے ساتھ ہی ساتھ مرد اور عورت کے ازدواجی تعلقات رسم نکاح کے پابند ہو گئے۔ عورت کا درجہ گر گیا اور وہ مرد کی ذاتی ملکیت بن گئی۔ اینگلز کی یہ کتاب ایک سائنٹیفک تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہے اور انسانی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر جماعت اسلامی کے علماء کمیونسٹ دشمنی میں اس قدر سرتاپا غرق ہیں کہ اینگلز کی اس کتاب سے چند فقروں کا حوالہ دے کر ان کے معنی اپنی منشا کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ مثلاً جماعت اسلامی کے ایک رکن نذر محمد خالد اینگلز کی کتاب مذکور سے چند فقروں کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

> "مارکس اور اینگلز کی ان تصریحات کا اصل مطلب اور منشا بالکل ظاہر ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اشتراکیت آزاد جنسی تعلقات کا جو داعیہ لے کر میدان میں اتری ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں جس پر کان کھڑے کئے جائیں بلکہ یہ تو وہی پرانی شے ہے جس پر اس دنیا میں اس سے پہلے برابر عمل ہوتا رہا ہے۔"[2]

---

[1] اس کتاب میں جہاں مصنف نے یورپ کے قدیم سماج کا ذکر کیا ہے، وہاں افریقہ اور امریکہ کے بعض قبیلوں کے متعلق لکھا ہے کہ موجودہ زمانے میں بھی ان قبیلوں میں بھائی اور بہن، ماں اور بیٹے اور باپ اور بیٹی میں ازدواج ایک عام شے ہے۔ انجیل میں بھی ان کا ذکر ہے۔

[2] "اشتراکیت۔ مذہب اور اخلاق" مصنفہ نذر محمد خالد صفحہ ۱۵۱۔

مولانا مودودی نے "جہاد فی الاسلام" میں عہد رسالت سے پہلے عرب قبیلوں کی باہمی رقابت، دشمنی، جنگ وجدل وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے عہد رسالت میں جنگ وصلح اور دشمنوں سے سلوک کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اگر اینگلز کی کتاب مذکور پڑھنے کے بعد جماعت اسلامی کے علماء وہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں جو نذر محمد خالد نے کیا ہے تو کیا "جہاد فی الاسلام" پڑھنے کے بعد یہی رائے قائم کی جائے کہ مولانا مودودی قبائلی رقابت، دشمنی، عصبیت اور جنگ وجدل کے حامی ہیں؟

قدیم سماج کی اندرونی تنظیم کے متعلق تمام تحقیقات نیز انجیل کے مطالعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وسائل پیداوار (پتھر کے اوزار، جنگلی پھل وغیرہ) قبیلے کی مشترکہ ملکیت تھے۔ عورتیں نہ کسی کی ذاتی ملکیت تھیں اور نہ مشترکہ ملکیت۔ ان کی حیثیت وہی تھی جو مردوں کی تھی اور جہاں تک مردوں اور عورتوں کے ازدواجی تعلقات کا تعلق ہے وہ اس رسم نکاح اور خاوند بیوی کے رشتہ کے پابند نہیں تھے جو بعد میں مروج ہوا۔ اس بات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اگر ہابیل وقابیل دونوں بھائیوں کا اپنی بہن سے شادی کرنے سے متعلقہ روایات کو پیش نظر رکھا جائے۔

ذاتی ملکیت کی نشوونما سے سماج متخاصم طبقوں میں منقسم ہوگیا، اور جنگ میں شکست دینے کے بعد شکست خوردہ قبیلوں کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو کنیزیں بنانے سے عورتوں کا درجہ مردوں کے برابر نہ رہا۔ کنیزوں کے ساتھ ہی ساتھ فاتح قبیلے کی عورتیں بھی مردوں کی ذاتی ملکیت بن گئیں۔ رفتہ رفتہ رسم نکاح کا نشوونما ہوا جو خاوند بیوی کے رشتہ کی اخلاقی مذہبی اور قانونی تصدیق کرنے لگی۔

غلام داری کے دور میں پیداوار کا اکثر وبیشتر انحصار غلاموں کی محنت پر تھا۔ چنانچہ دیگر تمام آلات پیداوار کی طرح غلام بھی مالکوں کی ذاتی ملکیت تھے، گائے، بھینسوں بکریوں

وغیرہ کی طرح خریدے، بیچے اور شہنشاہ کو خراج میں دیئے جاتے تھے۔ شکست خوردہ قبیلے تمام مال و اسباب سمیت مال غنیمت تھے۔ غلام مردوں کی طرح کنیزیں بھی اپنے آقا کی ذاتی ملکیت تھیں، اور رسم نکاح کے بغیر آقا کے اپنی کنیزوں سے ازدواجی تعلقات کو مذہب، اخلاق، رسم و رواج اور قانون جائز اور صحیح قرار دیتے تھے۔ نواب، راجہ اور ڈیوک اپنے شہنشاہوں کو خوبصورت سے خوبصورت کنیزیں بطور تحفہ پیش کرتے تھے اور شہنشاہ جب کسی پر مہربان ہوتا تھا تو اپنی کنیزیں بطور خلعت یا انعام بخش دیتا تھا۔

عہد رسالت سے پہلے صحرائے عرب کے نیم وحشی قبیلے مغلوب قبیلوں کے مال و اسباب اور مویشیوں کو لوٹ کر مردوں کو قتل کر دیتے اور عورتوں کو کنیزیں بنا لیتے تھے۔ عربوں کے قبائلی رسم و رواج اور اخلاق نکاح کے بغیر آقا کے اپنی کنیز سے جنسی تعلقات کو جائز قرار دیتے ہوئے کنیز کے بطن سے بچوں کو آزاد تصور کرتے اور انہیں وہی حقوق دیتے تھے جو قبیلہ یا خاندان کے دوسرے افراد کو حاصل تھے۔ اسلام نے اس قبائلی دستور میں اصلاح صرف یہ کی کہ ماں بننے کے بعد کنیز کو فروخت کرنا ناجائز قرار دیا اور آقا کی وفات کے بعد اس کنیز کو جو ماں بن چکی ہے آزاد قرار دینے کی ہدایت کی مگر اس سے حقیقت نہیں بدلی۔ کنیزیں بدستور اپنے آقا کی ذاتی ملکیت اور خرید و فروخت کی شے رہیں۔

وسائل پیداوار کی ذاتی ملکیت اور نفع کمانے کے لئے اشیاء کی پیداوار اور اُن کی خرید و فروخت موجودہ سرمایہ داری نظام کی بنیاد ہے۔ چنانچہ سرمایہ داروں نے تمام جاگیری پدرسر قبیلی اور دیہاتی رومانوی تعلقات کا خاتمہ کر کے تمام رشتوں حتیٰ کہ بھائی بہن، بیوی، خاوند اور باپ بیٹے کے رشتوں کو خالص تن پروری اور لین دین کے رشتوں میں بدل دیا ہے۔ چنانچہ عورت موجودہ سرمایہ داری نظام میں مرد کی ذاتی ملکیت، پیداوار کا محض ایک آلہ، نفع کمانے کیلئے خرید و فروخت کی

ایک جنس عیش کے ٹھیکے اور رعایات حاصل کرنے کا ایک وسیلہ اور نذرانہ، تحفہ یا رشوت پیش کرنے کی ایک شے ہے۔

عورتوں کو مشترکہ ملکیت بنانے کا پروپیگنڈا

سرمایہ داری کے اقتصادی نظام نے عورتوں کی عصمت وعفت کو انسانی طاقت محنت کی طرح خرید وفروخت کی جنس بنا دیا ہے۔ اعلانیہ اور پس پردہ زنان بازاری کا تم غفیر سرمایہ داری کے اقتصادی نظام کا منطقی نتیجہ ہے۔ کمیونسٹ عورتوں کو سب کی مشترکہ ملکیت نہیں بنانا چاہتے۔ یہ کام تو سرمایہ داروں کا ہے۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز اپنے متحدہ تاریخی شاہکار "کمیونسٹ مینی فیسٹو" میں لکھتے ہیں:

"اس سے زیادہ مضحکہ خیز اور کونسی بات ہو سکتی ہے کہ سرمایہ دار پاک دامنی کے جوش میں ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کمیونسٹوں کو طعنہ دیں کہ وہ عورتوں کو اعلانیہ اور قانوناً مشترکہ ملکیت بنانا چاہتے ہیں۔ کمیونسٹوں کو اس بات کی ضرورت نہیں۔ عورتیں صدیوں سے مشترکہ ملکیت ہیں"۔

"زنان بازاری کے بعد مزدوروں کی بہو بیٹیوں سے بھی جی نہیں بھرتا تو سرمایہ دار ایک دوسرے کی بیویوں سے ناجائز تعلق کرنے میں انتہائی مسرت محسوس کرتے ہیں"

موجودہ سرمایہ داری نظام میں زنان بازاری مشترکہ بیویاں ہیں۔ مزدوروں، مزارعوں اور دیہاتی غریبوں کی بہو بیٹیوں کو سرمایہ دار اور جاگیر دار نیز انکے عزیز واقارب منشی اور مختار اپنی بیویاں سمجھتے ہیں۔

مگر جماعت اسلامی کے علماء کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ انہیں اس اقتصادی سیاسی اور سماجی نظام کی پیدا کردہ خرابیاں اور بد اخلاقیاں نظر نہیں آتیں جس کی حمایت اور حفاظت کرنے کے لئے انہوں نے کمیونسٹوں سے "فکری" اور "عملی" جنگ جاری کر رکھی ہے۔ کاش ان کی رگِ حمیت یہ دیکھ کر بھڑک اٹھتی کہ انہی لغاریوں، نوابزادوں اور کالاباغوں کے ہاتھوں جو جماعت اسلامی کے

ہمدرد ہیں اور اس کا لٹریچر اپنے مزارعوں میں زبردستی فروخت کرتے ہیں، کسی مزارعہ، کسی غریب کسان اور کسی دیہاتی دستکار کی بہو بیٹی کی عصمت و عفت محفوظ نہیں۔

کمیونسٹ عورتوں کو نہ ذاتی ملکیت، نہ مشترکہ ملکیت، نہ پیداوار کا آلہ، نہ نفع کمانے کے لئے خرید و فروخت کی جنس اور نہ تحفہ یا نذرانہ کے طور پر پیش کرنے والی شے سمجھتے ہیں۔ وہ عورتوں کو مردوں کی طرح انسان سمجھتے ہیں، اور انہیں مردوں کے برابر حقوق دینے کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کی آزادی کی حمایت میں بڑی بڑی باتیں کرنے اور اپنی بیوی کو تتلی بنا کر کلبوں اور محفلوں میں لے جانے کے باوجود سرمایہ دار اسے پیداوار کا محض ایک آلہ اور ذاتی ملکیت سمجھتا ہے۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز اپنے تاریخی شاہکار "کمیونسٹ مینی فسٹو" میں لکھتے ہیں:

"سرمایہ دار اپنی بیوی کو پیداوار کا محض ایک آلہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ جب وہ پیداوار کے تمام اوزاروں اور وسیلوں کی مشترکہ ملکیت کی بات چیت سنتا ہے تو سوائے اس کے اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا کہ عورتوں کا بھی یہی حشر ہوگا۔ انہیں بھی سب مردوں کی مشترکہ ملکیت بنا دیا جائے گا۔"

یہی بات جماعت اسلامی کے علماء پر صحیح عائد ہوتی ہے۔ ان کی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ذہنیت عورت کو انسان سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ اپنی بیوی کو ذاتی ملکیت اور پیداوار کا محض ایک آلہ سمجھتے ہیں اور اسی لئے کمیونسٹوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ عورتوں کو سب مردوں کی مشترکہ ملکیت بنانا چاہتے ہیں۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز "کمیونسٹ مینی فسٹو" میں لکھتے ہیں:

"اس کے (سرمایہ دار کے۔ مترجم) وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ اصل مقصد عورتوں کی اس حیثیت کو ختم کرنا ہے جس میں وہ پیداوار کا محض ایک آلہ بن کر رہ گئی ہیں۔"

جب تک ہمارا سماج متخاصم طبقوں میں منقسم ہے، جب تک اقتصادی اعتبار سے عورتیں مردوں کی دست نگر اور محتاج ہیں، وہ پیداوار کا محض ایک آلہ رہیں گی۔ خاوند اور بیوی کے مابین رشتہ

خالص تن پروری اور لین دین کا رشتہ رہیگا اور کبھی ان کے تعلقات بے لوث محبت کی بنیادوں پر قائم نہیں ہونگے۔

سوویٹ نظام میں عورتوں کا درجہ

سوویٹ یونین، مشرقی یورپ کی عوامی جمہوریتوں اور عوامی چین میں اب وہ حالات نہیں رہے جنہوں نے عورتوں کو اقتصادی اعتبار سے مردوں کا محتاج اور دست نگر رکھ کر انہیں مردوں کی ذاتی ملکیت بنا رکھا تھا۔ انقلاب روس سے پہلے آذربائیجان، ترکمانیہ، تاتاریہ، باشکریہ، تاجکستان، ازبکستان کرغزیہ اور کازخستان کی مسلمان عورتوں میں پڑھی لکھی عورت کا نظر آنا ایک عجیب بات تھی۔ آج اس کے برعکس ہے۔ کوئی عورت ایسی نہیں ملتی جو پڑھی لکھی نہ ہو۔ ہمارے ہمسایہ تاجکستان میں جس کی آبادی ۱۶ لاکھ سے زیادہ نہیں ۱۹۴۹ء میں ۹۰ ہزار لڑکیاں مڈل اور ہائی سکولوں میں تعلیم پا رہی تھیں۔ آج زندگی کے ہر شعبہ میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ مسلمانوں کی ہر جمہوریت میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان عورتیں سائنسدان، آرٹسٹ، انجینئر، ڈاکٹر، پروفیسر، ادیب اور شاعر ہیں اور ملک کی معاشی سیاسی، تہذیبی اور سماجی زندگی میں ممتاز حیثیت کی مالک ہیں۔ تاجکستان کی پارلیمنٹ میں مسلمان عورتوں کی تعداد ۸۶ اور آذربائیجان کی پارلیمنٹ میں ۹۶ ہے۔ سوویٹ یونین کی مرکزی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں کازخستان کی طرف سے ۷۴، اور ازبکستان کی طرف سے ۵۶ نمائندے ہیں ان میں مسلمان عورتوں کی تعداد بالترتیب ۱۳، اور ۱۴ ہے۔ زار روس کے عہد میں مسلمان عورتوں کی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کو سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام نے فولادی شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ انقلاب روس نے اس فولادی شکنجے کو توڑ دیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں سے اپنے اپنے ملک کو جہنم سے جنت میں بدلنے کے لئے مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔

اقتصادی اعتبار سے مردوں کا محتاج اور دست نگر رہنے سے خاوند اور بیوی کے

رشتے کی خاصیت بدل گئی ہے۔ عورت مرد کے پاؤں کی جوتی نہیں رہی۔ دونوں کے درجہ ہیں اقتصادی، سیاسی اور سماجی برابری قائم ہونے سے ایک دوسرے کے حقیقی معنوں میں رفیق حیات بن گئے ہیں

سوویٹ یونین میں زنان بازاری کو تعلیم و تربیت اور روزی اور روزگار کی سہولتیں دے کر انہیں اچھے شہریوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے جس سے مشترکہ بیویوں کے سرمایہ دارانہ ادارے کا نام و نشان تک نہیں رہا۔ اس اشتراکی معاشرہ میں نہ مائیں کارخانوں کے اندر مشینوں کے نیچے بچے جنتی ہیں اور نہ بچے سڑکوں پر بھیک مانگتے اور گندی نالیوں میں کھیلتے ہیں۔ ہر حاملہ عورت کو بچہ جننے سے پہلے ۳۵ دن اور اس کے بعد ۴۲ دن کی باتنخواہ چھٹی ملتی ہے۔ علاوہ اس کے زچہ خانے کے اخراجات کے الاؤنس اور بچوں کی پرورش کے لئے وظیفہ ملتا ہے۔ تفصیلات یہ ہیں:

	زچگی کا الاؤنس	بچوں کا دو سال سے پانچ سال کی عمر تک ماہوار وظیفہ
تیسرا بچہ	۴ سو روبل	۵۰ روبل
چوتھا بچہ	۱۳ سو روبل	۸۰ روبل
پانچواں بچہ	۱۷ سو روبل	۱۲۰ روبل
چھٹا بچہ	دو ہزار روبل	۱۴۰ روبل
ساتواں بچہ	اڑھائی ہزار روبل	۲۰۰ روبل
آٹھواں بچہ	اڑھائی ہزار روبل	۲۰۰ روبل
۹ واں بچہ	تین ہزار روبل	۲۵۰ روبل
دسواں بچہ	ساڑھے تین ہزار روبل	۲۵۰ روبل
گیارھواں بچہ	پانچ ہزار روبل	۳۰۰ روبل

یہ اعداد "اے ٹو زیڈ آف دی سوویٹ یونین" نامی کتاب سے حاصل کئے گئے ہیں جو ۱۹۴۶ء

میں شائع ہوئی تھی۔ معاشی ترقی کے ساتھ ہر سال زچگی کا الاؤنس اور بچوں کا وظیفہ بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت اس الاؤنس اور وظیفے کی رقم ۱۹۴۶ء کے مقابلے میں زیادہ ہے

انسانوں کا اخلاقی معیار محض قانون بنانے، مجرموں کو سخت سزائیں دینے یا پند و نصیحت اور تبلیغ کرنے سے بلند نہیں ہوتا۔ اسے بلند کرنے کے لئے ان حالات کو ختم کر دینا ضروری ہے جو انسانوں کی اخلاقی گراوٹ کا موجب بنتے ہیں۔

سوویٹ یونین، عوامی چین اور مشرقی یورپ کی عوامی جمہوریتوں میں جہاں مجموعی طور پر تقریباً اسی کروڑ انسان (روئے زمین کی کل آبادی تقریباً سوا دو ارب ہے) آباد ہیں، پیداوار کے طریقے اور حالات بدلنے سے روزی روزگار کی کمی نہیں رہی چنانچہ رنگ و نسل، قوم، مذہب اور صنف کی بنا پر نفرت کے بجائے گرے ہوئے کو اٹھانے اور بھائی چارہ کا جذبہ ہر دل میں موجزن ہے۔ ایک نیا معاشرہ جنم لے رہا ہے۔ ایک نیا اخلاقی نظام ایک حقیقی انسانی اخلاق نشو و نما پا رہا ہے۔

مگر اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے جماعت اسلامی کے علما جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حقوقِ ملکیت کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم اور سوویٹ نظام حکومت کو "غیر فطری" "انسانیت کش" "اخلاق سوز" اور "اسلام دشمن" ثابت کرنے کے لئے کمیونسٹوں اور سوویٹ یونین کے خلاف سامراجیوں کے جھوٹے پروپیگنڈے کو اپنائیں اور عوام کو روزی روزگار اور آزادی کی جد و جہد میں حصہ لینے سے روکنے کے لئے سرمایہ داری اور جاگیرداری کی نرم لفظوں میں مذمت کرتے ہوئے عوام کو یقین دلانے کی کوشش کریں کہ وہ تمام مسائل جو موجودہ اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام میں حل نہیں ہو سکے، اخلاقی ذرائع سے زرداروں اور ناداروں کو ایک نقطۂ عدل پر متفق کرنے سے حل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ سارا زور کمیونسٹوں اور سوویٹ یونین کے خلاف پروپیگنڈا کرنے پر لگاتے ہیں۔ اور اسلام کے نام پر ایک ایسا معاشی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی نظام پیش کرتے ہیں جو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے حقوقِ ملکیت کی حفاظت کرتا ہے۔

BIBLIOGRAPHY

History of Arabs : Philip K. Hitti.

A Short History of the Saracens : Syed Amir Ali.

3. The Spirit of Islam : Syed Amir Ali.
4. Encyclopedia Brittanica.
5. History of Nationalism in the East : Kohn.
6. Foundations of Christianity : K. Kautsky.
7. Slave Society in Imperial Rome : K. Kautsky.
8. Studies in Indian Social Polity : B.N. Dutta.
9. A History of the U.S.S.R. Part I, II & III : A.M. Pankratova.
10. History of Western Philosophy : Bertrand Russell.
11. India To-day : R.P. Dutt.
12. Iran—Past & Present : D.N. Wilder.
13. The Indian Musalman : Hunter.
14. Marx-Engles Correspondence on India.
15. Communist Manifesto : Karl Marx & F Engles.

16. Origin of Family, Private Property & State : F. Engles.
17. Anti-Duhring : F. Engles.
18. Problems of Leninism : J. Stalin.
19. The Problem of India : K S. Shalvankar.
20. India Struggles for Freedom : H. Mukerjee
21 A to Z of the Soviet Union.

۲۲- اشتراکیت اور نظام اسلام - محمد مظہر الدین صدیقی

۲۳- اشتراکیت اور اسلام - مولانا مسعود عالم ندوی

۲۴- جہاد فی الاسلام - سید ابوالاعلیٰ مودودی

۲۵- سود " " "

۲۶- مسئلہ ملکیت زمین " " "

۲۷- اسلام کا نظام حیات " " "

۲۸- اسلام کا نظریہ سیاسی " " "

۲۹- اسلام کا اخلاقی نظریہ " " "

۳۰- اشتراکیت، مذہب اور اخلاق - نذر محمد خالد

۳۱- معاشی ناہمواریاں کا اسلامی حل - نعیم صدیقی

۳۲- منشور جماعت اسلامی

۳۳- فلسفۂ عجم - علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

۳۴- الغزالی - مولانا شبلی نعمانی

۳۵- مسلمانوں کا روشن مستقبل - مولانا طفیل محمد

۳۶- اسلام کا اقتصادی نظام - مولانا حفظ الرحمٰن

۳۷- مقدمہ تاریخ - ابن خلدون -

ہماری دیگر مطبوعات

علم المعیشت	سی۔ آر۔ اسلم	۳/۵۰
اساس لیننن ازم	جوزف ستالن	۳/۵۰
سوویت یونین میں محنت اور قوانین	ژاروف	۱/۵۰
مزدور تحریک کی تاریخ اور مسائل	بشیر احمد	۳/-
قومی تحریک آزادی کے دوست اور دشمن		۶/-
امن عالم کی جیت ہو	برژنیف	۱/-
امن اور خوشحالی کے راستے پر (دو جلدوں میں)	"	۴۰/-
سوویت یونین امن کی جدوجہد کے ۵۰ سال	"	۱۵/-
قومی آزادی کی تحریک کا حقیقی معاون		۱/۵۰
سرمایہ داری اور سوشلزم		۴/-
ہنگری شاہراہ ترقی پر		۵/-
دو سپر پاورز کے تصور کی اصلیت		۱/۵۰
مارکسی فلسفہ	سجاد ظہیر	۳/۵۰
اجتماعی خودکشی کا راستہ (جائزہ)	شوکت علی	۲/۵۰
لینن کے حالات زندگی		۳/۵۰

پیپلز پبلشنگ ہاؤس

پوسٹ بکس نمبر ۸۶۲۔ لاہور